
منتخبات
ڈاکٹر جعفر حسن
ناشر دی حیدرآباد بک ڈپو



منتخبات ہندی کلام

ڈاکٹر جعفر حسن

ناشر

دی حیدرآباد بک ڈپو، چادرگھاٹ، حیدرآباد دکن

قیمت (عـہ)
مجلد (عـہ ۳/۴)

जाति न पूछो साधु की पूछ लीज्ये ज्ञान।
मोल करो तरवार का पड़ा रहन दो म्यान॥

ذات نہ پوچھو سادھ کی پوچھ لیجئے گیان
مول کرو تروار کا پڑا رہن دو میان

"سادھو کی ذات دریافت نہ کرو۔ یہ تحقیق کر لو کہ علم کتنا ہے،
تلوار کی خرید کرو۔ میان کو (کیا دیکھتے ہو) اسے، پڑا رہنے دو"

فہرست مضامین

تمہید

تمہید

ہندی جملے کہاوتیں، مثالیں، اور دوہوں کے کچھ حصے اردو میں عام ہیں اور حیدرآباد میں بھی (جہاں ہندی جاننے والے بہت کم ہیں اور اردو داں ہندو حضرات کو بھی بالعموم اس زبان کے ادب کا کوئی خاص شوق نہیں) بولے جاتے ہیں ان کے سننے سے پتہ چلتا تھا کہ ہندی بڑی شیریں زبان ہے۔ سچ پوچھئے تو جس طرح یورپ میں فرانسیسی اور اسلامی ممالک میں فارسی شیریں زبانیں تسلیم کی جاتی ہیں اسی طرح ہندوستان کی بیسیوں زبانوں اور بولیوں میں غالباً ہندی سب سے زیادہ دلنشین اور موثر بھاشا ہے۔ ہندی نثر چاہے کیسی ہی ہو مگر ہندی شاعری کے متعلق تو بلا خوف تردید یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ

وہ بہت دلگداز، پراثر اور لطیف ہے الفاظ میں کچھ قدرتاً اس طرح کا لوچ ہے کہ معمولی کلام بھی مزیدار معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ نظمیں بھی جو فلسفیانہ نقطہ نظر سے ناقابل قبول ہوں، سننے والے ان سے بھی لطف اندوز ہو ہی جاتے ہیں۔

ہندی کی شیرینی و لطافت نے اگر ایک طرف ہندی ادب کے مطالعہ کی ترغیب دلائی تو دوسری طرف اردو ادب اور ہندی ادب میں موازنہ کرنے کے شوق نے اور زیادہ مستعدی سے ہندی ادب کی طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ جب کبھی علوم عمرانی کے مطالعہ سے جی اکتا جاتا تو ہندی شاعری علمی مشغلہ کے طور پر جاری رہتی۔

اس اثنا میں مجھے خیال ہوا کہ بجائے ہندی شعراء کے کلام کا راست مطالعہ کرنے کے اگر اردو کی وہ کتابیں پڑھی جائیں جو ہندی شاعری پر اردو میں لکھی گئی ہیں تو نہ صرف ترقی کی رفتار تیز ہو جائے گی بلکہ اس کام میں بہت مدد ملے گی۔ جب میں نے دریافت کیا تو باوجود تلاش کے صرف رسالہ "اردو" بابتہ جنوری ۱۹۲۲ء (حصہ پنجم) اور اکتوبر ۱۹۲۷ء (حصہ سی و دوم) کے دو مضامین از نیاز فتح پوری کے

رسالہ "ہندی بھاشا" کے سوا کوئی اور مضمون یا رسالہ ہندی شاعری کے متعلق اردو زبان کا دستیاب نہ ہوا۔ کتب فروشوں سے دریافت کیا کتب خانوں میں تلاش کیا۔ لیکن نفی کے سوا کہیں سے مفید مطلب جواب نہ ملا۔ جو مضامین ہندی شاعری پر گذشتہ زمانہ میں شائع ہو چکے ہیں یا یہ کہ پنجابی رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں ان کی کسے خبر؟ نہ ملک میں کوئی مرکزی دار الاشاعت، نہ کوئی اعلیٰ درجہ کا اردو مرکزی کتب خانہ جہاں اردو کی ہر مطبوعہ کتاب رسالہ (pamphlet) وجملہ رسائل (periodicals) دستیاب ہوتے ہوں۔ سال گذشتہ جب لکھنؤ اور دہلی جانے کا اتفاق ہوا تھا تو وہاں بھی کئی کتب فروشوں سے اردو میں ہندی شاعری کے متعلق دریافت کرتا رہا۔ یہ حسن اتفاق کہ ایک رسالہ "کبیر جنم ساکھی اردو" مولفہ منشی محمد خلیل انصاری "جامعہ ملیہ" کے دار الکتب سے ہاتھ آ گیا۔ اس کے بعد پھر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ سنا ہے کہ بھوانی پرشاد صاحب حیدر آبادی نے خانخاناں کی دوہاولی اردو میں حسینی علم حیدر آباد دکن کے کسی مطبع سے شائع کرائی ہے۔ میں نے ہر چند کوشش کی یہ دوہاولی کسی عام کتب خانہ یا احباب سے مل جائے مگر کامیا

نہ ہوا۔ ہندی بھاشا سے حیدر آباد میں جو عام ناواقفیت ہے اس سے
توبظاہر کامیابی کی کوئی امید نہیں معلوم ہوتی کس قدر افسوس کا مقام
ہے کہ کتب خانہ آصفیہ اور بالخصوص جامعہ عثمانیہ کے کتب خانہ میں
جہاں ہر سال ہزاروں روپیہ کی اردو، انگریزی و جرمانی کتابیں منگائی
جاتی ہیں اور جس ادارہ میں ہندی کی تعلیم بھی ایم۔ اے کی جماعتوں تک
دی جاتی ہے ایسی کتاب دستیاب نہ ہوسکی جو حیدر آباد ہی میں طبع ہوئی

جہاں کتب خانوں وکتب فروشوں کے ہاں ہندی کی بے قدری
کا یہ حال ہے وہاں شہر میں دو ایک ذاتی کتب خانے ایسے بھی ہیں
جہاں ہندی کی بھی قدر ومنزلت ہوتی ہے۔ خوش قسمتی سے میری سائی
ان میں سے ایک تک ہوئی، جو غالباً مقامی ذاتی کتب خانوں میں (جہاں تک
ہندی کتب کا تعلق ہے) بہترین ہے۔ میری مراد آغا حیدر حسن صاحب
کی لائبریری سے ہے جس میں بہت سی نادر و کمیاب مطبوعہ کتب کے
علاوہ بیسیوں اردو، فارسی و ہندی کی قلمی کتابیں ہیں۔

علم دوست حضرات کے لئے جنھیں ہندی ادب سے دلچسپی ہو
میں دو چار کتب کا حوالہ دینا چاہتا ہوں، تاکہ انھیں معلوم ہو جائے کہ

ہمارے اسلاف کو ہندی سے کس قدر دلچسپی تھی اور ہماری بے توجہی کی وجہ سے اب ان کی وجود کا علم بہت کم حضرات کو ہے۔

"بھگتی پرکاش" مصنفہ آسان داس، مہتاب رائے، بن چینی لال سن اشاعت ۱۸۹۱ء۔ یہ کتاب مجموعہ ہے بھجن و مناجات کا جس میں ہندی رسم الخط کے ساتھ ساتھ اردو رسم الخط میں بھی ہندی اشعار لکھے گئے ہیں۔ اس میں دوہرے، کبت، چوپائی پائے جاتے ہیں۔

"سارنگ ست سئی" مصنفہ جوشی انندی لال سنہ ۱۸۹۹ء مطبع منشی نولکشور میں ۱۸۹۵ء میں جوشی نامی کسی صاحب نے تقریباً چھ سو دوہے انتخاب کیے جس میں زیادہ تر بہاری لال کا کلام ہے۔ انھیں ہندی و اردو رسم الخط میں لکھا اور دوہروں کی تشریح فارسی زبان میں کی ہے۔ چونکہ اس وقت تک تعلیم یافتہ مسلمان فارسی عام طور پر سمجھتے تھے لہذا تشریح فارسی میں کی گئی ہے۔

"پدماوت بھاکھا مترجم" مترجمہ مرزا عنایت علی بیگ عنایت لکھنوی اشاعت سنہ ۱۹۰۸ء مطبوعہ مطبع اعظمی کانپور۔ ملک محمد جائسی کی مشہور تصنیف پدماوتی کا اردو ترجمہ ہے اردو رسم الخط میں اصلی ہندی نظم لکھی گئی ہے۔

اور ہر شعر کے نیچے اس کا اردو ترجمہ نثر میں کیا گیا ہے صفحہ کے حواشی پر مفرد الفاظ، مشکل مطالب اور تاریخی واقعات کی سرسری تشریح بھی کی گئی ہے۔

"پدماوت اردو" مترجمہ محمد قاسم علی صاحب رئیس بریلوی۔ اشاعت ۱۸۷۳ء مطبع نولکشور کانپور ملک محمد جائسی کی پدماوتی کا ترجمہ ہے جو اردو نظم میں کیا گیا ہے۔ بغیر اصل نقل کئے صرف منظوم ترجمہ ہی شائع کیا گیا ہے۔ پنڈت بالیشور پرشاد صاحب کی رائے میں منظوم ترجمہ ہونے کی وجہ سے یہ کتاب بہ نسبت عنایت علی بیگ کی تالیف کے زیادہ قابل قدر ہے۔

"تلسی کرت رامائن" مؤلفہ و مترجمہ پنڈت لچھمی دت ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول میرٹھ سنہ اشاعت ۱۸۷۲ء۔ مطبع گیان پرکاش پریس میرٹھ تلسی داس کی مشہور تصنیف رامائن اردو رسم الخط میں لکھی گئی ہے اور ساتھ ہی ہر چوپائی، دوہے وغیرہ کا ترجمہ شرح اردو نثر میں کیا گیا ہے۔

رسالہ ہذا کی تیاری میں البتہ ان کتب سے استفادہ کرنے کا موقع نہ ملا۔ یہ کتابیں اعلیٰ معیار کی ہونے کے علاوہ زبان کے اعتبار سے بھی

سہل نہیں اور زیادہ تر انھیں لوگوں کے کام کی ہیں جنھیں ہندی ادب پر کافی عبور ہو۔

اس انتخاب میں صرف تعلیم یافتہ طبقے کے مذاق کا خیال نہیں رکھا گیا اور گو زیادہ ایسے ہی دوہروں کا انتخاب ہے جنھیں میں عمدہ اور قابل قدر سمجھتا ہوں۔ مگر ساتھ ہی میں نے عمداً ایسے دوہے بھی منتخب کئے ہیں جو عام اردو داں پبلک کے لئے باعث دلچسپی ہوں۔ میری حقیقی نیت اس رسالہ کے مرتب کرنے سے صرف یہی ہے کہ اردو داں اشخاص کی خدمت میں ہندی شاعری کا سرسری خاکہ مجموعی حیثیت سے پیش کر دوں اور بالخصوص حیدرآباد میں ہندی شاعری کا ذوق پیدا کرنے میں اپنی بساط کے موافق معاونت کر سکوں۔

بعض عشقیہ دوہے اس انتخاب میں ایسے ملیں گے جو مذاق سلیم کو پسند نہ آئیں۔ مگر ان کے انتخاب پر محض اس وجہ سے اعتراض کرنا کہ پڑھنے والے کو پسند نہ آئیں کوئی حق بجانب بات نہیں کیونکہ اول تو لوگوں کے مذاق مختلف ہوتے ہیں اور پھر ایک ہی شخص کو مختلف اوقات میں مختلف مذاق کے دوہے پسند آتے ہیں۔ فلسفیانہ اور اخلاقی دوہروں کو

پڑھتے پڑھتے یا عالمانہ مسائل کے دوہروں کو دیکھتے دیکھتے جب طبیعت سیر ہوجاتی ہے یا یہ کہ جس وقت انسان خوشباش mood میں ہوتا ہے تو اس کی طبیعت ایسے کلام سے محظوظ ہوتی ہے جو بالکل معمولی ہو۔ اچھے اچھے عالم بھی بعض اوقات سطحی چیزوں کے لذت گیر ہوا کرتے ہیں۔ تاہم جیسا کہ ناظرین آئندہ خود معلوم کرلینگے اس قسم کے دوہوں کی تعداد بہت کم ہے۔ میں نے خاص لحاظ اس امر کا کیا ہے کہ دوہروں میں ایک حد تک تسلسل رہے۔ چنانچہ عشقیہ دوہروں کی ترتیب سے اس کا ثبوت ملے گا کہ بیان حسن، ابتدائے عشق، جدائی، اور مفارقت، شوق دید اور حسرت ملاقات کے بعد باز دید کے دوہرے ترتیب سے رکھے گئے ہیں۔ جس قدر دوہے اس سلسلہ میں یکجا کئے گئے ہیں، وہ مجھے مختلف ذرائع، مختلف اوقات اور مختلف اشخاص سے فراہم ہوئے ہیں، اردو تو اردو ہندی میں بھی یہ سب دوہے یک جا نہیں ملیں گے۔

یہ میرا خوشگوار فریضہ ہے کہ ان لوگوں کا شکریہ ادا کروں جنھوں نے مجھے عمدہ عمدہ دوہے سنائے ظاہر ہے کہ اتنے دوہوں کا انتخاب

میں اگر راست ہندی شعراء کے کلام سے کرتا تو اس کے لئے مہینوں درکار ہوتے۔ سب سے زیادہ میں رائے بالیشور پرشاد صاحب مسرا رئیس اٹاوہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھیں کی بدولت مجھے ہندی ادب سے واقفیت ہوئی۔ صاحب موصوف نے کمال شفقت و مہربانی سے دوہوں کے انتخاب میں مدد دی اور اپنی یادداشت سے کئی عمدہ دوہے سنائے ان کے علاوہ مولوی سید منظر علی صاحب اشہر اور آغا حیدر حسن صاحب دہلوی نے عمدہ عمدہ دوہے سنا کر میری امداد کی۔

ترتیب رسالہ کے وقت "اردو" کے دو رسالے (جلد دوم حصہ پنجم اور جلد ہشتم حصہ سی و دوم) اور نیاز محمد خاں صاحب نیاز فتح پوری کی مختصر مگر کارآمد کتاب موسومہ "جذبات بھاشا" میرے پیش نظر تھی ان میں جن دوہوں کا انتخاب کیا ہے وہ بیشتر عشقیہ ہیں وہ بھی ایسے جن کا قریبی تعلق جنسیت (sexualism) سے ہے۔ اردو دان اشخاص کے دل میں ان منتخبہ دوہروں کے پڑھنے سے اس خیال کے پیدا ہونے کا سخت اندیشہ تھا اور ہے کہ ہندی شاعروں نے جذبات

عالیہ، اوصاف حمیدہ اور مسائل فلسفہ پر بہت کم لکھا ہے اسی غلط فہمی
کی وجہ سے میرے ایک ملاقاتی نے ہندی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے
یہ بیان کیا کہ "ہندی شعراء کی لطافت و شیرینی سب رنگ تغزل میں
ختم ہوگئی اور عشق و عاشقی کے علاوہ ہندی میں کچھ نہیں"! اسی غلط فہمی کو
دور کرنے کے لئے میں نے غیر عشقیہ دوہوں کا انتخاب زیادہ کیا ہے
جس سے ناظرین خود اندازہ کرسکتے ہیں کہ ہندی شعراء نے غیر عشقیہ موضوعات
پر (subjects) کیا کچھ نہیں کہا ہے۔

ہندی کی خصوصیات

ہندی زبان کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی شیرینی و لطافت
ہے۔ اس بھاشا کے ممتاز شعراء (کے اعلیٰ کلام) کی خصوصیت یہ ہے کہ
جو کچھ وہ کہتے ہیں اُسے نہ صرف عقل تسلیم کرتی ہے بلکہ قلب بھی قبول
کرتا ہے، کیونکہ ہندی شعراء زیادہ تر الفاظ میں موسیقی کا بھی لحاظ کرتے
تھے یہی وجہ ہے کہ جو سلسلۂ نغمائی ان کے کلام میں پایا جاتا ہے وہ
دوسری زبان کے شعراء کے کلام میں نہیں پایا جاتا۔ فلسفیانہ مسائل و حقایق کو

سیدھے سادھے طریق پر یا اصطلاحی زبان میں بیان کرنا اور بات ہے اور انھیں واقعات کو دلنشین پیرایہ میں ادا کرنا جداگانہ شئے ہے! ان میں شعرا کو زیادہ تر اس وجہ سے کامیابی ہوتی ہے کہ ہندی خود "سراسر ترنم اور سراپا لوچ ہے"۔ تغزل میں تو ہندی شعرا نے اپنے دلنشین پیرایہ بیان سے وہ کمال حاصل کیا ہے کہ اس سے بڑھ کرنا ممکن نہیں تو غیر اغلب ضرور معلوم ہوتا ہے۔ جو خصوصیت اردو میں میرؔ کو اور جرمن میں ہائنے (Heine) کو حاصل ہے وہ ہندی کے تقریباً ہر باکمال شاعر میں موجود ہے۔

"بھاشا کی عاشقانہ شاعری میں سب سے بڑی خصوصیت جو اس کو اُردو اور فارسی شاعری سے ممتاز بنا دیتی ہے' یہ ہے کہ اقتضائے فطرت انسانی کے مطابق اس میں تخاطب مرد کا عورت سے اور عورت کا مرد سے ہوتا ہے (اُردو فارسی کی طرح یہ نہیں کہ امرد پرستی کا بازار گرم ہے) یہی سبب ہے کہ شاعر کے دل میں جذبات محبت بالکل سچے اور صحیح پیدا ہوتے ہیں کیونکہ پاکیزہ جذبات کا پیدا ہونا جب ہی ممکن ہے جب کہ ان کے پیدا کرنے میں اقتضائے فطرت سے جنگ

نہ کی جائے"(۱) مثل اردو فارسی کے ہندی ادیب نے "ایشیائی حیا کے تقاضے سے معشوق کے چہرے پر دراز دراز ی کا نقاب(۲) ڈال کر کلام کو متقید نہیں کیا ہے بلکہ اُسے اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ فطری جذبات بالکل (natural) نیچرل طور پر بیان ہوئے ہیں اور مثل اردو کے ہندی جذبات نگاری بناوٹی تہذیب ور پر تصنع حیاداری جسے "ایشیائی حیا" سے تعبیر کیا جاتا ہے کے ہاتھوں برباد نہیں ہوئی بلکہ ہندی شعرا کی قادرالکلامی کی بدولت دوگنی شان ولطافت میں نمودار ہوئی۔

"دوسری نہایت دلکش و دل آویز خصوصیت یہ ہے کہ عموماً تخاطب جنس لطیف کی طرف سے ہوتا ہے اور یہ ایسی خصوصیت ہے کہ اگر اس کی اور تمام خوبیوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تب بھی دنیا کی تمام زبانوں کی شاعری پر اس کو نمایاں امتیاز حاصل ہو جائے گا"(۳) اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندی شاعری زیادہ تر مردوں ہی نے کی اور مثل اور زبانوں کے

---

(۱) خلیقی دہلوی (در تقریب "جذبات بھاشا" صفحہ (۳) نگار پریس لکھنو۔
(۲) اُنہ "ہماری شاعری" مصنفہ سید مسعود حسن رضوی انجمن ترقی اردو مصنف (حصہ ہماری شاعری)
(۳) خلیقی دہلوی (در تقریب "جذبات بھاشا") صفحہ ۳ نگار پریس لکھنو

بہترین شعر کہنے والے مرد ہی تھے۔ لہٰذا اس شبہ کا پیدا ہونا ممکن ہے کہ مرد کیونکر عورت کے جذبات اور نسوانی خیالات کی ترجمانی کر سکے ہوں گے مگر جو اصحاب ہندی سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہندی شعرا نفسیاتی مشاہدات کرنے میں کمال رکھتے تھے اور مرد عورت تو کجا بے زبان درندوں و پرندوں کے احساسات کو اس خوبی سے بیان کرتے تھے کہ اگر ان بے زبانوں میں طاقت گویائی ہوتی تو بھی وہ اس سے بہتر طریق پر بیان نہ کر سکتے۔

ان بیانات میں ہندی شعراء نے تشبیہات و تمثیلات سے بہت مدد لی اور جیسا کہ کتاب ہذا کے پڑھنے سے واضح ہوگا۔ وہ اس طریق شاعری میں استاد کامل تھے اور یہ ان کی اسی جادو نگاری کا اثر ہے کہ وہ معمولی سی معمولی بات کو تشبیہ کے پیرایہ میں لاجواب طریق سے اثر خیز بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ہندی شعرا کی سحر نگاری کا بڑا راز اسی حقیقت میں مضمر ہے اور ہم کہ گل و بلبل، سرو و قمری، کے قصے سنتے سنتے بیزار ہو گئے ہیں ہندی شعرا کی انداز تحریر، ان کی قدرت تخیل، نفسیاتی مشاہدات، شیرینی کلام، لطافت زبان، انداز تمثیلات کو پڑھ کر محظوظ ہوتے ہیں جس طرح

شیکسپیر نے صحیح کہا ہے کہ ہر زبان سیکھنے سے انسان میں ایک نئی روح
پیدا ہوتی ہے اسی طرح ہندی شاعری بھی ہمارے نیم مردہ جسم میں
نئی جان ڈالتی ہے

خصوصاً اس لحاظ سے کہ ہندی اردو داں لوگوں کے لئے نہایت
آسان ہے ہمیں اس زبان کی طرف اور زیادہ متوجہ ہونا چاہئے - اور
مدارس میں اردو ہندی کو ایک ہی رتبہ دینا چاہئے۔ فارغ التحصیل حضرات
بھی ہندی بہت آسانی سے سیکھ سکتے ہیں اور جہاں ہم برسوں کی محنت
سے بمشکل انگریزی سیکھتے ہیں اور انگریزی ادب سے محظوظ ہوتے ہیں وہاں
ہم اس قدر اور کر سکتے ہیں کہ چند ماہ کی محنت سے ہندی سیکھ لیں اور
اس کے بیشمار ادبی کتابوں اور دیوانوں سے مستفید اور محظوظ ہوں قومیت
کے اعتبار سے تجارتی سہولت کی غرض سے اور مستقبل کی ضروریات کے
لحاظ سے ہمیں سخت ضرورت ایک ایسی زبان کی ہے جو ہندوستان کی
قومی زبان بن سکے اگر ہندی داں اردو اور اردو داں ہندی پڑھنا
شروع کر دیں تو بہت جلد ہندی اور اردو کی بول چال ایک ہو جاوے گی
[illegible] کے اعتبار سے کوئی [illegible] نہ ہوگا

اور ہندو مسلمان متفق ہو کر اس کو تمام ہندوستان کی قومی زبان بنا کر،
ادبی یکجہتی کے ساتھ ساتھ لسانی یکجہتی کی بنیاد قائم کر دیں گے۔

ان فوائد سے قطع نظر ہماری مراد تو صرف یہ ہے کہ بقول شیکسپیئر
"ایک نئی روح" پیدا کرنے کے لئے اُردو داں حضرات جنہیں ادبی شوق
ہو ہندی پڑھیں، خصوصاً اس لئے کہ بمقابلہ انگریزی یا کسی اور دوسری زبان
کے ہندی سیکھنے کے لئے عشر عشیر محنت بھی نہیں کرنی پڑتی۔

اگر اس تھوڑی ہی محنت اور جانکاہی سے ہمیں نسبتاً ایک عظیم الشان
فائدہ ہوتا ہے تو ہمیں چاہئے کہ دوگنی رغبت و مستعدی سے اس ہم شیر
شیریں زبان کی طرف متوجہ ہوں اور اس لاپروائی اور بے اعتنائی کا
خاتمہ کریں جو ہم بالکل بے جا طور پر اس سے برت رہے ہیں۔

"Yet in spite of its	پھر بھی باوجود اپنی
limitations Hindi	کمزوریوں کے ہندی
literature has many	ادب میں بہت
excellencies, and is	خوبیاں ہیں اور
worthy of much greater	وہ اس کی مستحق ہے کہ

موجودہ زمانہ کی توجہ
سے بہت زیادہ
اس کا مطالعہ کیا جائے
صحیح طور پر ہندی
ادب "بستانِ مسرت"
سے تعبیر کیا گیا ہے" [1]

study than it has
yet received.
It has been
truly described
as a 'Garden of
Delight' "

بہر طور ہندی ادب و شاعری اس قابل ہیں کہ ہم اس کی طرف
جلد از جلد متوجہ ہوں اس کی اشاعت و تبلیغ کے لئے کوشاں رہیں اور
اس کے ادب کو بالخصوص اردو داں حضرات میں تشہیر و مقبول عام
(Popularize) بنانے کے لئے باضابطہ جدوجہد کریں
خصوصاً اس لئے کہ ہندی بھاشا کو کسی خاص مذہب و ملت سے کوئی
تعلق نہیں۔ اس کے ثبوت میں صرف ان غیر ہندو شعرا کا نام گنانا
کافی ہے جو ہندی کے مسلم الثبوت اُستاد اور باکمال شاعر مانے گئے ہیں

---

(1) "A History of Hindi Literature" by F. E. Keay
Association Press, Calcutta, 1920

گرو نانک اگر سکھ تھے تو ملک محمد جائسی، (جن کی مشہور تصنیف "پدماوت" اس درجہ نظر استحسان سے دیکھی گئی کہ اکثر مشائخ، متصوفین اس سے نکات تصوف حاصل کرتے ہیں)[۱] عبدالرحیم خانخاناں (جن کی "ست سئی" کا رتبہ تلسی داس کی "رامائن" اور بہاری لال کی "ست سئی" کے لگ بھگ ہے) مسلمان تھے، یہ بھی اردو داں حضرات سے پوشیدہ نہیں کہ امیر خسرو اور اکبر اعظم ہندی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے گو ان کا کلام غیر معمولی طور پر اچھا نہ ہوتا تھا تاہم ان کے شوق و انہماک کو ظاہر کرتا ہے، پنڈت رام نریش ترپاٹھی نے اپنی تمہید "کوتا کومدی" میں اکیس[۲] باکمال مسلمان ہندی شعرا کے نام گنائے ہیں اور سچ کہا ہے کہ "کسی کسی مسلمان شاعر نے تو ہندی میں ایسی اچھی شاعری کی ہے کہ اس کے ایک ایک شعر پر کتنے ہی ہندو شعرا کا کلام نچھاور کر دیا جا سکتا ہے۔[۲]"

---

(۱) نیاز فتح پوری: "جذبات بھاشا" نگار پریس لکھنؤ ص ۹۰

(۲) دیکھئے: کوتا کومدی۔ پہلا بھاگ۔ مطبوعہ ہندی مندر الہ آباد ۱۹۱۸ء ص ۱۵

ہندی بھاشا اور مسلمان

ہندی اور مسلمانوں میں کیا ربط و تعلق ہے اس کے ثبوت کے لئے اس سے بہتر کیا مثال پیش کی جا سکتی ہے کہ مسلمانان ہند کے ساتھ ساتھ ہندی نے ترقی کی اور انھیں کے ساتھ اس پر زوال آیا۔ جو زمانہ مسلمانان ہند کا "زرین عہد" کہلائے جانے کا مستحق ہے وہی زمانہ ہندی بھاشا کا بہترین دور شاعری کا تھا۔

جس طرح مسلمانوں کے قدم ہندوستان میں بتدریج جمتے گئے ویسے ہی بتدریج ہندی بھی ایک مختلف زبان کی شکل اختیار کرتی گئی اور اکبر کے زمانے میں اس نے خاص عروج حاصل کیا۔ اکبر کے مختلف النوع کارناموں میں ہندی کی ساخت و پرورش بھی تھی۔ وہ نہ صرف ہندی میں طبع آزمائی کرتا تھا[1] بلکہ ہندی زبان کی نشر و اشاعت

(۱) اس کے متعلق ایک عیسائی تبلیغی انجمن کے رکن نے یہ گمان ظاہر کیا ہے کہ زیادہ تر اکبری کے غیر فانی مشہور ماہر موسیقی تان سین نے بادشاہ کے نام سے (جو ہندی میں اکبر رائے تخلص کرتا تھا) اشعار موزوں کئے ہیں (دیکھئے A History of Hindi Literature by Keay صفحہ ۳۵) ہمیں حیرت تو اس دلیری پر ہوتی ہے کہ تبلیغی انجمن کے ارکان ملکی ادبیات میں دخل انداز ہو کر اس قسم کی بے سر و پا بدگمانیاں کرتے ہیں اور اپنے خیالات کی تائید میں کسی عالم یا پنڈت کی رائے یا دیگر تاریخی اسناد کو بھی پیش نہیں کرتے۔ اس طرح یہ لوگ خود ان خدمات پر تماشہ ڈالتے ہیں جنھیں انجام دینے کی انھیں صلاحیت نہیں ایک طرف ملکی ادب کی خدمت دوسری طرف یہ غیر عالمانہ دل آزاری! کیا اجتماع ضدین ہے!

تبلیغ و تشہیر کا بانی و مؤید تھا۔ چنانچہ اس نے خود اپنے ہی خاندان سے اس کی ابتدا کی اپنے بیٹے جہانگیر کو بھی اکبر نے ہندی سکھائی اور اپنے پوتے خسرو کو تو چھ برس کی عمر میں ہی ہندی سیکھنے کے لئے ایک برہمن پنڈت کے سپرد کر دیا تھا۔ شاہ جہاں اپنی مادری زبان کے ساتھ ہندی زبان پر بھی قدرت رکھتا تھا۔ اور اس کے دربار میں ہندو شعرا کا منتخب گروہ رہتا تھا۔ اس کا بڑا لڑکا دارا نہ صرف ہندی کا بلکہ سنسکرت کا بھی بڑا عالم تھا اور اس نے "اپنشدوں" کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ اورنگ زیب کو بھی ہندی سے اچھی طرح واقفیت تھی خود اس زبان کو سیکھنے کے علاوہ شاہان مغلیہ اور ان کے وزیروں اور درباریوں نے جو قدر دانی کی وہ بھی لایق تحسین، اور ہم ہندی زبان سے بے بہرہ اور اس کے ادب سے ناواقف لوگوں کے لئے قابل عبرت ہے۔

اورنگ زیب کا درباری شاعر ورند تھا جسے اخلاقی دوہے کہنے میں خداداد ملکہ تھا اور ہندی زبان میں اس سے بہتر پند و نصیحت کے دوہے کہنے والا شاعر کوئی اور نہیں گزرا۔ اورنگ زیب کے

پوتے عظیم الشان جو بنگال، بہار اور اڑیسہ کا صوبہ دار تھا اور خود
ہندی میں شاعری کرتا تھا۔ اپنے دادا کی اجازت سے ورند کو اپنے
ہمراہ ڈھاکہ لیتا گیا جہاں وہ مستقل طور پر قیام کرتا تھا۔

اسی طرح عالمگیر کے بیٹے شہزادہ معظم کا درباری شاعر عالم پیدائشی
برہمن تھا مگر اس نے کسی مصلحت سے مذہب اسلام اختیار کر لیا تھا۔

تان سین کو (جو نہ صرف بیمثل ماہر موسیقی بلکہ ہندی کا شاعر بھی
تھا) اکبر نے پہلے ہی مجرے میں ۲ لاکھ کا انعام دیا تھا، بیرم خاں
خانخاناں نے بابا رام داس کو ایک ہی دن میں ایک لاکھ روپیے
دئے تھے۔ شاہ جہاں نے ایک ہندی شاعر کے کلام سے محظوظ ہو کر
اس کے ہم وزن روپیوں سے اس کو سرفراز کیا تھا۔ اور ایک دوسرے
موقعہ پر کسی ہندی شاعر کو جاگیر عطا کی تھی۔

نواب عبدالرحیم خانخاناں، نہ صرف عربی، فارسی، سنسکرت کا
عالم تھا بلکہ جیسا کہ کہا جا چکا ہے ہندی کا ایک زبردست وباکمال
شاعر تھا اور ساتھ ہی علم پروری، حوصلہ افزائی اور علم دوستی میں شاہان مغلیہ
کے بعد یکتائے زمانہ، عہد اکبری کا چمکتا تارہ، اور دربار اکبری کا پُر

جمال مہتاب تھا۔ جس کی فیاضی اور علم پرستی کے متعلق بیسیوں قصے افسانے مشہور ہیں۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شاعروں اور باکمال علماء کے لئے اس نے ہمیشہ فراخ دلی سے کام لیا۔ ایک ایک دوہے یا کبت کے صلہ میں ہزار ہا روپیہ انعام میں دئے، اور اپنے مخصوص شاعر دوستوں (جس میں تلسی داس جیسے یکتائے روزگار کا بھی شمار تھا اگرچہ یہ تارک الدنیا ہونے کی باعث اس کی فیاضی سے مستفید نہ ہو سکتے تھے) کے لئے تو اس کا خزانہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔

اس سے زیادہ اثبات کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟ یہ ہماری نادانی ہے کہ ایسی بے مثل، مالا مال زبان سے بے توجہی کریں، اور خصوصًا اس وجہ سے کہ تھوڑی سی محنت سے ہمیں یہ زبان آسکتی ہے۔ ہم اس کے سیکھنے میں بے التفاتی برتیں۔ میر و غالب، انیس و دبیر، داغ و اکبر، اقبال و حسرت کے پرستار ہندی شعرا تلسی داس و بہاری لال، عبد الرحیم و کبیر داس، سور داس و سور داس، ملک محمد و بھوبائی کے کلام کو بھی دیکھیں کہ ان میں کیسے کیسے علمی و ادبی خزانے مدفون ہیں غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے یہ کہنا ضروری ہے کہ اس دور میں تخفیف

(Era of specialization) میں ہر ایک کے لئے عام ہندی ادب کے مطالعہ کی چنداں ضرورت نہیں۔ اگر مدرسوں میں عربی، فارسی، تلنگی، مرہٹی وغیرہ کی طرح ہندی بھی زبان زائد کے طور پر پڑھائی جائے تو بہت سے لوگ ہندی سے بھی مستفید ہو سکیں گے اور جیسے فارسی علم و ادب میں اشاعت ہوتی ہے اسی طرح ہندی علم و ادب کے جاننے والے ہم میں بھی پیدا ہوتے جائیں گے گو اس زمانہ میں ایسے لوگ مفقود نہیں پھر بھی ان کی تعداد میں اضافہ کی بہت کچھ گنجایش موجود ہے اور ہندی جاننے والوں کی تعداد میں بہت کچھ اضافہ کی ضرورت مطلوب ہے۔

ہندی کی کم قدری کی نہ صرف ہندوستان ہی میں بلکہ یورپ میں بھی عام شکایت ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے جرمانیہ کی کسی یونیورسٹی یا علمی ادارہ میں ہندی کی تعلیم نہیں ہوتی اور جرمانیہ جیسے مردم خیز خطہ نے ہندی کا عالم تو کجا، ہندی کا جاننے والا اور ہندی ادب سے شوق رکھنے والا بھی اب تک پیدا نہیں کیا۔ حالانکہ اسی ملک نے بیسیوں مستشرقین ایسے پیدا کئے جو عربی، فارسی، سنسکرت کے مستند

ماہر گذرے ہیں شاید ہی کوئی مشرقی علوم و فنون میں دلچسپی رکھنے والا تعلیم یافتہ شخص ایسا ہو جو پاؤل دائسن (Paul Deussen) اور ماکس مویلبر (Max Müller) کے نام سے واقف نہ ہو۔ تعجب ہے کہ جرمانیہ جیسے علم دوست ملک میں تلسی داس کا سمجھنے والا کوئی بھی نہیں۔

اس کم قدری کی شکایت اب انگلستان میں بھی سننے میں آ رہی ہے چنانچہ مسٹر ٹامس آرنلڈ "Encyclopaedia Britannica" میں لکھتے ہیں:(۱)

"It (Hindi) covers a wide range of style, and, at its best, expresses a rich variety of human feeling. It deserves much more attention in Europe than it has received."

"ہندی ایک وسیع دائرہ طرز کلام کو محیط کئے ہوئے ہے اور اپنی بہترین شکل میں انسانی جذبات کے مختلف النوع احساسات کو ظاہر کرتی ہے اور اب تک جو کچھ توجہ کی گئی اس سے وہ بہت زیادہ کی مستحق ہے"

---

(۱) دیکھئے: XIV Edition. 1929 Vol. XI. p. 573

اگر اس کتاب کے مطالعہ سے کسی طرح بھی ہندی ادب کی قدر و منزلت کا لوگوں کو احساس ہو سکے گا یا یہ کہ ہندی ادب کی نشر و اشاعت میں ہندی کے خیر خواہوں کی مدد ہو سکے گی تو میں سمجھوں گا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوا اور جو کچھ محنت و دردسری مجھے اس کی تیاری میں گوارا کرنی پڑی اس کا نعم البدل بھی مجھے مل گیا۔

اس دور تخصیص میں تخصیصی کام ہی کی ضرورت ہوتی ہے اور ایک مغربی علمی ادارہ کے سابق طالب علم (وہ بھی معاشیات کے جس کا زرین اصول قانون تقسیم عمل ہے!) کے متعلق یہ گمان تو بمشکل ہی ہو سکے گا کہ تخصیص (specialization) کا وہ قائل نہیں۔ پھر بھی اگر وہ باوجود طالب علم عمرانیات و معاشیات ہونے کے ہندی شاعری کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کی عذر خواہی (apology) میں صرف دو ہی دلیلیں کافی ہوں گی۔ یہ کام یوں تو اردو ہندی ادبیات کے ماہرین کا تھا۔ جب انھیں ہی اس کا خیال نہ ہوا تو مجبوراً برا بھلا اپنے اوقات فرصت میں بجائے گپ شپ کرنے کے یا بیکاری میں وقت صرف کرنے کے مَیں ہندی کلام کی تشریح و توضیح کرتا رہا۔ لہذا یہ

انتخاب ہندی شاعری بہ مصداق اس انگریزی قول کے Failed or succeeded friends – just say he tried. (ناکام رہا ہو یا کامیاب اے دوستو صرف یہ کہو کہ اس نے کوشش کی!) قابل معافی ضرور ہے۔

تشریحات پر dilettantism کا اعتراض ایک حد تک ضرور کیا جا سکتا ہے میری تشفی کے لئے یہ خیال کافی ہے کہ اس سلسلہ میں مجھے علم عمرانیات کی (جس سے ہندوستان میں نسبتاً بہت کم لوگ واقف ہیں) چند ضروری باتوں کے بیان کرنے کا اور (جیسا کہ حاشیوں میں ظاہر کردہ حوالوں سے واضح ہے) چند اہم بیرونی علماء و ماہرین عمرانیات و دیگر علوم عمرانی کے خیالات کے تذکرہ کا موقع مل گیا۔

اخلاقی رنگ

ہندی جذبات عالیہ

(۲۱)

उज्जल बरण अधीम गत एक चरन दुइ ध्यान
मैं जानुं कुई भगत है परनिपट कपट की खान॥

बरण (برنْر) = رنگ अधीम (ادھیم) = آہستہ خرام
गत (گت) = چال भगत (بھگت) = زاہد
(کھان) = خزانہ

اُجل برنڑ، ادھیم گت، ایک چرن دوی دہیان
میں جانوں کوئی بھگت ہے، پر نپٹ کپٹ کی کہاں

"صاف لباس اور سیدھی ادا مگر ایک کردار میں دو دہیان!!
میں سمجھی تھی کہ کوئی بھلا مانس ہے مگر (در اصل) وہ تو برائیوں کا خزانہ ہے"
یہ ایک عام مشاہدہ ہے جو بالکل معمولی طریق پر ظاہر کر دیا گیا۔
اس دوہے میں کوئی خاص بات قابل تعریف نہیں۔ اسی مطلب کو
کسی اور شاعر نے خوب ادا کیا ہے جس میں نہ صرف تمثیل کی خوبی بلکہ

الفاظ کی شیرینی دوہے کو چہار چند لطیف بنا دیتی ہے۔

तन उजरो मन कोयला   बगले का सा भेस ।
तो सें तौ कागा भलो   बाहर भीतर एक ॥

اُجرو)۔ اجلا' صاف   (کاگا)۔ کوا) उजरो   कागा

تَنْ اُجْرو، مَنْ کوئلہ بگلہ کا سا بھیس
توسے تو کاگا بھلو' باہر بھیتر ایک

اس مذہب کی نگاہ میں جو نہ صرف بین الاقوامی ہے بلکہ حضرت آدم سے لے کے قیامت تک رہا اور رہے گا۔ یعنے وہ مذہب جس کے ستون عقل انسانی اور فہم عامہ ہے اس کی نگاہ میں تو کم از کم ریاکاری تصنع، بناوٹ بدترین عیب ہے اور رہے گا۔ اس لئے ترکوں کی دعا اپنے خالق اکبر سے یہ ہوتی ہے کہ " اے خدا تو مجھے میرے دوستوں سے بچا' اپنے دشمنوں سے میں اپنی حفاظت آپ کر سکوں گا۔"

---

(۳)

میں نے تمہید میں بیان کیا ہے کہ ان رسالوں اور مضمونوں کے دیکھنے سے جو اردو مخزنوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں، اردو دان پبلک کو یہ گمان ہونے کا سخت اندیشہ ہے کہ ہندی کلام کی شیرینی عشق و تغزل ہی میں ختم ہو گئی اور ان کا خیال عشق و عاشقی تک محدود ہے۔ حالانکہ ہندی شعرا نے اخلاقیات میں بھی بہت کچھ تحقیقات کی ہے۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ انھیں عملی اخلاقیات کے لئے معیار کردار قائم کرنے میں قابل رشک کامیابی ہوئی ہے۔ جس کا ثبوت حسب ذیل کبت ہے جس میں انسانی Ideal کو ظاہر کیا ہے۔

मीर में मीर अमीर वुही   जो अमीर हुए पै गरूर करै ना।
पीर में पीर फकीर वुही   जो फकीर हुए पै सुवाल करै ना।
तारीफ उसी तरवार की है   जो चार पै अपने झुरै ना मुरै ना।
मर्द में मर्द वुही है भलो   जो कहै सो करै जो करै सो कहै ना।

میر میں میر امیر وہی، جو امیر ہوے پہ غرور کرے نا!
پیر میں پیر فقیر وہی جو فقیر ہوے پہ سوال کرے نا!
تعریف اسی تروار کی ہے جو وہار پہ اپنے جھرے نا مڑے نا!
مرد میں مرد وہی ہے بہلوؔ جو کہے سو کرے جو کرے سو کہے نا!

اس کبت میں قابل تعریف بات یہی ہے کہ اس میں الفاظ کی الٹ پھیر بڑے مزے کی ہے مفہوم کا کیا کہنا؟ صحت تخیل میں کیسے گمان ہو سکتا ہے؟ خصوصاً آخری مصرعہ انتہا درجہ کا لطیف اور بامعنی ہے۔

---

(۴)

जो बरते जिह रीत तासैं तैसी बरतीये ।
साध सन्त से प्रीत कपटी से करये कपट ॥

रीत (ریت) = طریقہ کپٹ (کپٹ) = فریب ۔ کینہ ور ۔ دشمن

جو برتے جہ ریت، تا سے تیسی برتے
سادہ سنت سے پر نیت کپٹی سے کرے کپٹ

انسان کے لئے معیار کردار کیا ہونا چاہیئے؟ اس کا صحیح جامع و مانع جواب دینا ایک نہایت دشوار فلسفیانہ کارنامہ ہے۔ مذاہب عالم میں فطرت انسانی کے مطابق (جہاں تک ہمیں علم ہے) غالباً سب سے پہلے حضرت موسیٰ نے، دانت کے بدلہ دانت اور آنکھ کے بدلہ آنکھ کی تلقین کی جس کو مذہب اسلام نے بھی اپنے نظام مذہبی میں منتقل کرلیا حضرت موسیٰ کے صدیوں بعد بے تخت و تاج شاہ یروشلم نے (جس کے نظری معتقدین کی جماعت تمام مذاہب عالم میں سب سے زبردست ہے اور اپنے اندر تعدادی وسعت کی بھی سب سے زیادہ گنجایش رکھتی ہے) قابل تحسین مگر ناقابل عمل اصول عملی اخلاقیات کے لئے یہ مقرر کیا کہ "کوئی تمھارے چانٹا مارے تو مغلوب الغضب نہ ہو بلکہ اُسے دوسرا گال دکھاؤ"۔

یہ ہندی شاعر موسیت کا قائل ہے۔ چنانچہ عملی زندگی کے لئے

اس کی دانست میں بہترین امر یہی ہے کہ "تمھارے ساتھ جو شخص جس قسم کا برتاؤ کرے اس کے ساتھ تم بھی ویسا ہی سلوک کرو۔ نیکدل (آدمیوں) کے ساتھ محبت اور جابروں کے ساتھ جبر!"

---

(۵)

انسان کے لئے معیار کردار کیسا ہونا چاہیئے؟ یہ وہ معرکتہ الآرا دقیق اخلاقی مسئلہ ہے، جس کی خاطر خواہ مکمل تحلیل اب تک کسی نے پیش نہیں کی۔ "دوسروں کے ساتھ ایسا سلوک کرو جیسا کہ تم چاہتے ہو کہ دوسرے تمھارے ساتھ کریں" یہ قدیم ترین اصولِ کردار اکثر مواقع پر اگرچہ کارآمد و مناسب ثابت ہوا ہے تو بیسیوں حالات میں اِس پر عمل کرنا فہم عامہ کے خلاف اور عقلِ بشری کے مخالف ہے ایک ناچ رنگ کا شوقین، اور طمطراق کے شیدائی دوست کی شادی کے موقع پر اگر اس کے کسی عزیز یا دوست کی طرف سے پرتکلف دعوت دی جائے تو بیشک یہ اس کی خوشنودی کا باعث ہوگا۔ برخلاف اس کے جب وہی دعوت ایک ایسے شخص کی اعزاز میں دی جائے جسے ناچ رنگ تو ایک طرف

لوگوں کی کثرت ہی سے نفرت ہو اور جو اپنا وقت چند منتخب احباب کی صحبت میں راحت و آرام، اور ہمکلامی و خوش مذاقی میں صرف کرنا چاہتا ہو باعث خوشنودی نہیں بلکہ بمشکل قابل برداشت ایذا ہوگی۔ اب میزبان اپنے قلب کو یہ کہہ کر تشفی نہیں دے سکتا کہ "مقررہ اصول کردار کے مطابق میں نے عمل کیا۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگ جب میری دعوت کریں وہ پرتکلف اور تماشہ آمیز ہو اور بیاہ شادی کی تقریب میں کھیل کود، ناچ رنگ، روشنی اور آتشبازی ہو!"

اسی لئے انگلستان کی مایہ ناز ہستی نے جو غالباً دنیا کا تنہا ظریف فلسفی ہے خوب کہا کہ "دوسروں کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرو جیسا کہ تم چاہتے ہو کہ دوسرے تمھارے ساتھ کریں۔ مذاق مختلف ہیں"(۱)

یہ ہدایت کہ "اس رخ چلو جس طرف زمانہ جارہا ہے" سراسر اصول اکثریت پر مبنی ہے اور جو عیوب اکثریت کے مطابق عمل کرنے سے نمودار ہوتے ہیں اس کا ذکر دنیا کی ہر تاریخ کے ہر دور میں ملتا ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اس پر عمل قطعی ناممکن ہے اور اگر ایسا ہوتا رہتا تو دنیوی ترقی ناممکن

---

(۱) "انسان و فوق الانسان" مصنفہ جارج برناڈشا ضمیمہ انقلاب پسند کے لئے اقوال

ہو جاتی اور تبدیلیوں کا واقع ہوتا رہنا ایک امر محال ہوتا اگر زمانہ کا ساتھ دینا صحیح معیار ہوتا تو گوتم بدھ حضرت عیسیٰ اور حضرت محمدؐ کبھی زمانے کے خلاف نہ جاتے اور نہ کرامول، روسو اور سن یات سین نظام سیاسی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے اور براہ راست یا بالواسطہ اپنے اپنے زمانہ کے نظام سیاسی کو تباہ کرتے یہی حال حالی اور ان کے بعض معاصرین کا تھا کہ اردو ادبیات کے تین چوتھائی مردہ جسم میں اپنے تازہ خیالات کے ذریعہ نئی جان ڈال دی۔

جس طرح اکثریت کے خلاف چلنے سے کئی رہنمایان ملک مدبران سلطنت نے اقوام و ممالک عالم کو تباہی و بربادی سے بچایا اسی طرح اکثر مواقع پر اکثریت کے موافق عمل کرنے سے جانیں تباہ ہوئیں، ملک غارت ہوئے اور ندامت و پشیمانی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ جنگ صلیب کے ہر موقع پر جب کہ تمام ممالک یورپ میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا تھا اور لوگوں کی پریشان حالی اور سراسیمگی نے دانائی و فراست، پیش بینی و دور اندیشی کی قوتوں کو معدوم کر رکھا تھا، جن لوگوں نے اپنی جانیں کھائیں اور ناقابل بیان مصیبت کا

سامنا کیا اور اپنی مرفہ الحالی کو ایک لاحاصل مقصد میں ضائع کیا دنیا کے لئے ایک عبرت انگیز سبق انسان کو شرکت اکثریت کے خطرات سے آگاہ کرنے کا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اکثریت کے مطابق عمل کرنے یا نہ کرنے میں فوائد بھی ہیں اور نقائص بھی اور زمانہ کے ساتھ چلنے کی ہدایت میں کوئی مطلق قابلِ اعتماد صحت نہیں۔

ہمیں ضرورت ایسے معیارِ کردار کی ہے جو قابلِ اطمینان و قابلِ اعتماد ہو ماہرین عمرانیات نے اس کی جستجو میں تحقیر و تحسین کے تعلق کو مسئلہ معیار کردار سے ظاہر کر دیا جس کا لبّ لباب یہ ہے کہ صحیح کردار پر ہمعصروں کی تحقیر و تحسین کا کوئی اثر نہیں پڑتا اور کردار کے اچھے یا بُرے ہونے کا ثبوت ہمعصروں کی تحقیر و تحسین سے نہیں اخذ کیا جا سکتا لہذا معیار کردار ہمعصروں کی تحقیر و تحسین پر نہ تو مبنی تھا ہے نہ ہو سکتا ہے! شاہان ذی مرتبت جیسے "نیرو" "کارلِ اول" "لوئی شانز دہم یورپ" میں "نادر شاہ" "علاء الدین" اور "محمد شاہ رنگیلے" مشرق و ہند میں ان لوگوں کے لئے قابل عبرت ہیں جو خوشامدی درباریوں اور خود غرض ریاکار عہدہ داروں کی "واہ واہ" کے نعروں اور تحسین کے کلموں کے سننے سے

مخبوط الحواس ہو کر نہ صرف اپنی اپنی سلطنت کھو بیٹھے بلکہ بعض اپنی
غلطی کا کفارہ اپنی جان سے ادا کرنا پڑا زمانہ گزشتہ کا کیا ذکر خود موجودہ
زمانہ کے ان بیسیوں بادشاہوں، وزیروں، عہدہ داروں، اور با اثر لوگوں
کو دیکھئے کہ تحسین نے انھیں کس درجہ پر پہنچایا۔ بسمارک کو وزارت سے
علیحدہ کرنے سے آخر وقت تک ولیم دوم سابق شہنشاہ جرمانیہ کے
حرکات افعال و اعمال پر مرحبا و تحسین ہوتی رہی اور ولیعہد جرمانیہ کو
نوجوانانِ ملک قوم کا دیوتا ماننے لگے تھے اور ایک زمانہ وہ تھا جب
ولیم نے اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہا تھا "آج سے میں قومی فرقوں کو
جانتا ہی نہیں میرے لئے سب کے سب صرف جرمن ہی جرمن ہیں" جس پر چاروں
طرف سے صدا اٹھی کہ "اے قیصر ہم تجھ پر اور تیری رہبری میں اپنی جانیں
قربان کرنے کو آمادہ ہیں" "قابل تعریف کردار" قیصر جرمن کا بیشک تھا
مگر آج وہی جرمانی شہنشاہ ہے کہ اس کے افعال و اعمال کو وہی لوگ
احمقانہ ٹھہراتے ہیں جو کسی زمانے میں ان کے ہم خیال پیرو اور معتقدین
تھے۔ اسی طرح بیسیوں بادشاہ، عہدہ دار، دولت مند غارت ہوئے
اور اپنے ساتھ اپنے ملک کو، اپنی قوم کو، اپنے خاندان کو لے ڈوبے

لارڈ نارتھ کے اکثر ساتھی، ہمعصر و ماہرینِ سیاسیات اس کی پالیسی سے متفق، اور اسے قابلِ تعریف سمجھتے تھے۔ جب لارڈ نارتھ نے انگلستان کو وہ نقصان پہنچایا جس کی تلافی قیامت تک نہ ہو سکے گی یعنے انگریزوں کے ساتھ سے امریکہ جیسا زرخیز خطّہ جاتا رہا تو خود اسی کے فرقہ والوں نے لارڈ نارتھ کو ملعونِ سلطنت قرار دیا۔ یہی حال Bethmann Hollweg کا جرمانیہ میں اور زارِ روس کے وزراء کا رشیا میں ہوا۔ جس طرح ڈسرائیلی کے اصول جبر و تشدد نے آئرلینڈ میں آگ لگا دی تھی، اسی طرح آج کرزن کی بدولت جس کی ہزارہا انگریز مداحی کرتے ہیں ہندوستان ایک انقلاب عظیم میں ہے۔ جو لوگ گل و بلبل کے افسانوں میں اپنا جی بہلاتے تھے، دال چپاتی پر قناعت کرتے تھے اور دن رات، الٰہیات تصوف اور تحلیلِ فلسفہ میں مستغرق رہتے تھے وہی حکومت وقت کی قوانین شکنی کر رہے ہیں! وہ بھی چوری چھپے اکا دکا نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں کھلم کھلا علی الاعلان۔ بیدار طبقہ کا کیا ذکر نیم خوابیدہ طبقہ کا یہ حال ہے کہ جن لوگوں کی زبان پر آؤم ہتا اب ہوم ہے جن کا دھیان اول پھول میں ہتا اب

رول میں ہے۔ گل وبلبل کو چھوڑ کر لوگ اب "تحصیل آزادی" اور "تحفظ حقوق" کے لئے لڑ رہے ہیں۔

جس طرح ہمعصروں کی تحسین پر بہ حیثیت معیار خیر وشر اعتماد نہیں کیا جاسکتا اسی طرح ہمعصروں کی تحقیر بھی بھروسے کے قابل معیار نہیں دانتے جب سڑک پر گھومنے نکلتا تو لوگ اس پر ہنسا کرتے تھے اور اکثر اوقات اس پر تھوکتے تھے۔ انھیں باشندگان روم نے (اسی مقام پر جہاں Giardano Bruno کا اب ایک مجسمہ کھڑا ہے!) برونو کو سات سال قید میں رکھنے کے بعد زندہ جلایا تھا۔ اور شہری "شیطان زمانہ" کو جلتا دیکھنے کے لئے دور دور سے علی الصباح پہنچے تھے۔ عہدہ داران سلطنت، نمایندگان کلیسا، روسا اور دیگر اشخاص کو بطور خاص اس تقریب میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی! اور جس وقت برونو کے لئے مرگھٹ تیار ہو چکا اور وہ لایا گیا اس کی تحقیر کے لئے اس کی نظروں کے سامنے جس قدر برونو کی تصانیف، رسالے اور مقالے دستیاب ہوسکے تھے وہ بھی لکڑیوں پر ڈال دئیے گئے اور ان میں آگ لگا دی گئی۔ ایک مصنف کے لئے

اس سے زیادہ تحقیر اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی لکھی ہوئی کتابوں کے انبار پر زندہ جلایا جائے جس وقت شعلے قدآدم بلند ہونے لگے مجمع میں ایک حشر برپا ہو گیا، عوام ٹوپیاں اچھالتے تھے، عہدہ دار حقارت سے ہنستے تھے اور نمایندگان کلیسا ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے۔ اور صرف دو چار ہی ایسے تھے جنہیں یہ یقین تھا کہ جانشین سقراط آج قوم کی بدعقلی پر بھینٹ چڑھایا گیا۔

جو لوگ آج لاک کی تصانیف میں ریسرچ کرتے کرتے زندگیاں گزار دیتے ہیں انھیں کے بزرگوں نے لاک کی سختی سے مخالفت کی تھی اُسے بدعقل ناکارہ اور بیوقوف ٹھہرایا تھا آکسفورڈ میں جس وقت لاک کی کتابیں حاکم ضلع کے حکم سے جلائی گئیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے طلباء فرط شوق سے ناچنے لگے تھے اور خوب تالیاں بجائی تھیں۔

یہ ہے قدر ہمعصروں کی تحسین و تحقیر کی۔ پھر انسان ان پر کیونکر بھروسہ کرے اور کس طرح انھیں معیار کردار بنائے؟ اخلاقیات کی جو کچھ کتابیں میری نظر سے گزری ہیں اور جو کچھ درس میں نے اس علم کے حاصل کئے ہیں اور جس قدر لکچروں کے سننے کا مجھے اتفاق ہوا ہے

اس میں تو کوئی اصول یا قانون ایسا نہیں ملا جو ہر موقع محل کے لئے اور ہر ایک زمانہ کے ہر ایک شخص کے لئے بطور ہدایت کے کام آسکے اکثریت کی موافقت و مخالفت ہمعصروں کی تحقیر و تحسین بعض حالتوں میں صحیح ہیں بعض میں غلط موقع پر سب صحیح ہیں اور بے موقع سب غلط ہیں ایک قطعی معیار قائم کرنے کا دعویدار اگر کوئی اصول ہو سکتا ہے تو وہ یہ ہے

जो तू आया जगत में जगत सराहै तोय ।
ऐसी करनी कर चलो पाछै हंसी न होय ॥

जगत (جگت) ۔ دنیا

جو تو آیا جگت میں جگت سراہے توئے
ایسی کرنی کر چلو، پاچھے ہنسی نہ ہوئے

"جو تو دنیا میں آیا ہے ساری دنیا تجھے سراہتی ہے (اور منہ در منھ تعریف و تحسین کرتی ہے) اس طرح کام کیا کر کہ (تیرے پیٹھ پیچھے اور) تیرے بعد ہنسی نہ ہو"

یہ ایک حقیقت ہے کہ بالعموم منہ درمنہ تعریف بہت زیادہ
کی جاتی ہے اسی طرح مذمت و تحقیر پیٹھ پیچھے زیادہ ہوتی ہے۔ پیٹھ
پیچھے کس قدر مذمت ہوتی ہے اس کی صحیح خبر تو شاذ و نادر ہی ہوتی ہے
اور جب کبھی ہوتی ہے اس پر انسان شاید ہی اعتبار یا اسے قابل
لحاظ تصور کرتا ہے۔ برعکس اس کے منہ در منہ تعریف خود اس کی موجودگی میں
کی جاتی ہے اور مشیخت (Vanity) کا مارا انسان ان کو
جان و دل سے سنتا ہے تعریف کے الفاظ کی آواز سُریلی گت سے
زیادہ دلفریب بن کر اس کے کانوں میں گھنٹوں تک گونجتی رہتی ہے
اور انسان ہے کہ چھوٹے بڑے یار اغیار، دوست، دشمن، سب کے
منہ در منہ تعریف کرتا رہتا اور سراہتا ہے کسی کو ہمت دلانے اور
دل رکھنے کے خاطر تو بعض کو بزرگ سمجھ کر بعض کی لحاظ سے تعریف کرتا
ہے تو چند کی وہ عین مصلحت سے مدح سرائی کرتا ہے۔ دوست کی مروت
سے تعریف کرتا ہے تو دشمن کو بنانے کی خاطر بہر طور الٹی سیدھی تعریف
تقریباً ہر شخص دوسروں کے سامنے کرتا ہے۔ اس عالمگیر ریاکاری کی بدولت
دنیا میں جھوٹی تعریف، قصیدہ گوئی، مدح سرائی، چاپلوسی، ظاہرداری،

دنیا داری جس قدر عام ہیں اس کا اندازہ ہر شخص ذاتی تجربہ سے کرسکتا ہے جس کو دیکھو وہ لحاظ، مروت، ہمدردی، بیوقوفی مصلحت یا دنیاداری کی باعث سراہنے میں مصروف ہے، بیٹا باپ کی، والدین اولاد کی، محکومین حاکمین کی، دوست احباب کی ملاقاتی اغیار کی ظاہرہ تعریف میں مصروف ہیں۔

شاعر کہتا ہے کہ اُس خوشامدانہ تعریف کی تو پرواہ نہ کر اور دنیا میں ایسی گذر کر کہ تیری ہنسی تیری پیٹھ پیچھے یا تیرے بعد نہ ہو!"

بادی النظر میں معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کس قدر اہم اخلاقیاتی انکشاف ہے جس معیار کی تلاش میں مصری علماء، یونانی حکیم، فرانسیسی، جرمانی انگریز ماہرین اخلاقیات تھے وہ اس شاعر کے دماغ نے ڈھونڈ نکالا۔ اب اس معیار کو کسی حالت یا کسی موقع پر منطبق کرکے دیکھئے کہ وہ صادق آتا ہے یا نہیں۔ گزشتہ زمانہ کی کسی واقعہ کو پیش نظر رکھئے یا حال کے کسی معاملہ پر غور کیجئے آپ ہی پائیں گے کہ انسان کا کردار اکثریت کے ساتھ رہنے یا نہ رہنے یا تحقیر و تحسین پر مبنی نہیں بلکہ اِن کے اچھے یا بُرے ہونے کا انحصار اس حقیقت پر ہے کہ بعد میں اس کی ہنسی ہوتی ہے یا نہیں۔

آج جو قومی وقار وسطوت کے لئے اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں اور عیش وراحت نثار کر کے جسمانی تکالیف جھیل رہے ہیں ان پر لوگ ہنس رہے ہیں اور پیٹ کے غلاموں اور دولت کے پجاریوں کی قدر ومنزلت ہو رہی ہے، خادم قوم مصیبت میں ہیں اور ابن الوقت مزے لوٹ رہے ہیں۔ اول الذکر پر دنیا ہنس رہی ہے اور دوسروں کو سراہ رہی ہے۔

بحیثیت نظریہ کے اس میں کوئی گرفت کا موقع ہی نہیں کہ انسان کو اس طرح عمل کرنا چاہیئے کہ بعد میں اس کی ہنسی نہ ہو۔ عملی مشکل یہ رہجاتی ہے کہ بعد کے حالات کا پتہ کیونکر چلایا جائے۔ اس کے لئے بیشک یہ ضروری ہے کہ انسان میں "فہم عامہ" قدرت مشاہدہ، طاقت ادراک، دور اندیشی، معاملہ فہمی، عاقبت اندیشی اور موقع شناسی کی نادر خصوصیتیں موجود ہوں۔ تاہم جب انسان حال کا نہیں ماضی کا نہیں بلکہ مستقبل کا خیال کرے گا اور اپنی طبیعت پر زور ڈال کر سوچے گا کہ میرے کردار پر کیا بعد میں ہنسی ہوگی تو اسے بیشتر یا کم از کم اب سے کہیں زیادہ موقعوں پر صحیح نتائج اخذ کرنے میں کامیابی ہوگی۔

جن بڑے آدمیوں کے حالاتِ زندگی کا ہم مطالعہ کرتے ہیں، جن اولوالعزم سیاحوں کے کوائفِ سفر ہماری نظر سے گزرتے ہیں جن عالی ہمت ماہرینِ فن کے کارناموں سے ہمیں واقفیت ہوتی ہے جن رہنمایانِ مذہب کے ایثار، قربانی، جانکاہی و جانفشانی کا ہمیں علم ہوتا ہے جن قوم پرست رہبرانِ ملت کی سوانح حیات ہم پڑھتے ہیں ان سب سے ایک ہی کلیہ اخذ ہوتا ہے :-

ایسی کرنی کر چلو پاچھے ہنسی نہ ہوئے

---

(۶)

आग लगी है वृक्ष को जलने लगे पात ।
तू क्यों जरै है पंखिया पंख हैं तेरे साथ ॥
फल खाये इस वृक्ष के गंदे कीन्हे पात ।
अब है मेरा धर्म यह जर जाऊं इह साथ ॥

سوال شاعر۔

آگ لگی ہے برکش کو جلنے لاگے پات
تو کیوں جرے ہے پنکھیا پنکھ ہیں تیرے ساتھ؟

جواب طائر۔

پھل کھائے اس برکش کے گندے کینے پات
اب ہے میرا دھرم یہ، جر جاؤں ایہہ ساتھ

वृक्ष (برکش)= درخت	पात (پات)= پتے
पंखया (پنکھیا)= پرندہ	पंख (پنکھ) یعنے پر رکھنے والا پرندہ
इह (ایہہ)= اس کے

بَن میں آگ لگی ہے اور اس درخت تک شعلے پہنچنے لگے ہیں جس پر ایک پرندے نے بسیرا کیا تھا۔ شاعر پرندے سے مخاطب ہو کر پوچھتا ہے درخت کو آگ لگی ہے (اور) پتے (بھی) جلنے لگے (ہیں) اے پرندے! تو کیوں جلتا ہے تیرے تو پر ہیں (اڑ کیوں نہیں جاتا؟) (یہ سن کر پرندہ

جواب دیتا ہے) اس درخت کے بیں۔ نے پھل کھائے اور اس کے پتے بھی گندے کئے۔ میرا ایمان تو یہ ہے کہ اسی کے ساتھ جل کر تباہ ہو جاؤں۔"

راست باز، حق شناس، ایماندار، وفا شعار انسانوں کا روز ازل سے یہی شعار رہا ہے کہ جب اپنے مالک و سرپرستوں پر یا محبوب و دلبر پر مصیبت آتی ہے تو خود بھی انھیں مصیبتوں میں شریک رہتے اور غمخوار بنتے ہیں اور باوجود استطاعت کے اپنے رفیق و ہمدرد کو مصیبت میں چھوڑ کر فرار نہیں ہو جاتے۔ دنیا میں گو اس اعلیٰ ہمتی وفاداری ملنساری حقیقی دوستی اور سچی محبت کی مثالیں کم ملتی ہیں مگر نایاب نہیں جس وقت Capt. Scott نے ۱۹۱۲ء میں بہ ہزار دقت و پریشانی منزل مقصود پر پہنچکر یعنے قطب جنوبی پر قدم رکھا اور خوشی خوشی اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر لوٹے تو ان کی پارٹی کے ایک ممبر بنام ایونز Evans کے پیر سردی کی شدت اور برف میں گامزنی کرنے کی باعث چلنے پھرنے سے معذور ہونے لگے اور روز بروز ان کے لئے مسافت کا طے کرنا مشکل ہوتی گئی۔ لامحالہ سکاٹ کی پارٹی کو بھی اپنی رفتار سست کرنی پڑی

جب ایک دن کا سفر دو دن میں اور دو دن کا پانچ دن میں طے
ہونے لگا تو یہ بھی خوف پیدا ہوا کہ اس سست رفتار سے اگر راہ طے
ہوگی تو راستہ ہی میں تمام کھانا پینا ختم ہو جائے گا' ساتھ ہی یہ خیال
لوگوں کے دلوں کو بےچین کر رہا تھا کہ وہ زمانہ بھی قریب آتا چلا جا رہا
ہے جب قطبِ جنوبی میں برف کے طوفان آتے ہیں اور برف کی
آندھیاں چلتی ہیں۔ لاچار مایوس ہو کر جب کسی طرح دوا درمن نے
فائدہ نہ کیا اور ایک ایک قدم چلنا Scott کے رفیق ایونز
Evans کے لئے ناممکن ہوا تو اس نے اپنا مصمم ارادہ ظاہر کیا
کہ وہ لوگ اسے راہ پر تنہا چھوڑ کر چلے جائیں۔ اپنے ارادہ کے ساتھ ہی
اس نے انھیں ہر ممکن طریق پر سمجھایا کہ ایک کی خاطر چار کا مرنا خودکشی ہے
قوم کو ان کی طاقتوں کی ضرورت ہے بالخصوص Scott کو یوں مادر
وطن کھو نہیں سکتی۔ اس نے ہر طریق پر لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی اور
کہا کہ وہ دل سے انھیں معاف بھی کر دیتا ہے کہ وہ اسے چھوڑ کر چلے جائیں
جیسے جیسے وہ سمجھاتا جاتا تھا Scott اور اس کے تندرست ساتھی
مستقل مزاجی سے کہتے جاتے تھے کہ جائیں گے تو سب مل کر جائیں گے

ورنہ ایک کے ساتھ سب فنا ہو جائیں گے۔ نتیجہ بالآخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ایک سخت طوفان نے Scott اور اس کے ساتھیوں کا خاتمہ کر دیا۔ اور اس طرح پہلے مرتبہ ہی قطب جنوبی کو جب انسان سے سابقہ پڑا تو اس نے بہادری، وفاداری، مستقل مزاجی، عالی ہمتی، فرض شناسی اور مروت و ہمدردی کی بہترین مثال دیکھی۔

برطانوی، امریکی، جرمانی، فرانسیسی، اور دیگر ممالک کے بیڑوں میں جتنے ناخدا ہیں ان کی انتہائی تعلیم و تہذیب اور ان کے پیشہ وری اخلاقیات کا اعلیٰ ترین مطالبہ یہ ہے کہ جہاز کو اپنی جان سمجھو، چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ جب کبھی کسی اتفاقی یا ناگہانی آفت سے جہاز پر مصیبت آتی ہے تو ناخدا جملہ مسافرین اور ملاحوں کو کشتیوں میں سوار کرا کے موجوں کے سپرد کر دیتا ہے اور انھیں اپنی جان بچانے کا ایک اور موقع دیتا ہے مگر خود جہاز ہی پر بہادری اور متانت سے کھڑا رہتا اور اپنے جہاز کے ساتھ غرق ہو جاتا ہے یہ خودکشی نہیں ہے بلکہ عالی ہمتی، نفس کشی نہیں ہے بلکہ وفاداری۔

جس طرح چتوڑ کے فتح ہونے پر راجپوت مستورات نے بے عزتی کی

زندگی پر موت کو ترجیح دی اور پدماوتی اور اس کی سہیلیوں نے جانیں نثار کر دیں۔ اسی طرح شاندار شاہ میسور نے جس کی بہادری پر تمام جنوبی ہندوستان ناز کر سکتا ہے اپنے قلعہ اور سلطنت کے خاتمہ پر لڑتے لڑتے اپنی جان بھی قربان کر دی تھی۔

غرض کہ دنیا میں جتنے سچے بہادر حقیقی وفادار یعنے پکے دوست گزرے ہیں وہ نہ صرف شریکِ مسرّت بلکہ رفیقِ غم بھی ہوئے ہیں۔ انہی مطالب کو ہندی شاعر نے اپنے خاص انداز میں جس خوبی اور کامیابی سے بیان کیا ہے اس کی مثال باوجود تلاش کے اردو فارسی انگریزی اور جرمانی ادب میں نہ مل سکی۔

سوالِ شاعر۔

آگ لگی ہے برکش کو جلنے لاگے پات　　　تو کیوں جرے ہے پنکھیا پنکھ ہیں تیرے ساتھ

جوابِ طائر۔

پھل کھائے اس برکش کے گندے کینے پات　　　اب ہے میرا دھرم یہ جر جاوں ایہہ ساتھ!

سوالیہ دوہے میں لفظ "تو" کو زور دے کر اور جواب کے آخری شعر کو لے میں بار بار پڑھئے تو آپ کو ان دوہوں کا حقیقی لطف آئے گا وفاداری

ایمان، ایثار، قربانی اور ہمت کی تصویر آنکھوں کے سامنے نظر آئے گی جنگل کی آگ اور اس پرندہ کے جلنے کا سماں پیش نظر ہوگا اور آپ کی روح اس مقناطیسی قوت کو محسوس کرے گی جو اس لافانی مصرع میں نظر بند ہے

"اب ہے میلو دھرم یہ جر جاؤں ایہہ ساتھ"

---

(۷)

मीन काट जल धोइये खाये अधिक पियास।
रहमान प्रीत सराहिये मुए मीत की आस ॥

मीन (مین) = مچھلی अधिक (ادھک) = اور زیادہ
मीत (میت) = دوست

مِین کاٹ جل دھوئے کھائے اَدھک پیاس
رحمٰن پریت سراہیئے، مُوئے مِیت کی آس

بلند خیالی، ندرتِ تشبیہ اور معنی آفرینی، یہ تینوں خصوصیات اِس دوہے میں پائی جاتی ہیں بغیر پانی کے مچھلی جس قدر تڑپتی ہے اس کا حال تو ہم سب کو معلوم ہی ہے۔ شاعر نے نئی بات یہ پیدا کی ہے کہ مچھلی کا پانی کے لئے بیقرار رہنا ظاہر نہیں کیا (کیونکہ یہ ایک بدیہی امر ہے) بلکہ یہ ثابت کیا ہے کہ پانی کو بھی مچھلی سے اُنس ہے۔ چنانچہ پانی کی وفاداری کا ثبوت دینے کے لئے کہتا ہے "مچھلی (پانی سے جدا ہونے کے بعد) جب کاٹی جاتی (اور صاف کی جاتی) ہے تو پانی ہی میں دھوئی جاتی ہے (یعنی پانی مچھلی کا ساتھ نہیں چھوڑتا) مچھلی کے کھانے کے بعد پیاس اور زیادہ محسوس ہوتی ہے اے رحمٰن۔ (پانی کی) محبت (وفا) کی تعریف کر کہ مردہ دوست (مچھلی) کی آس (پانی میں) اب تک باقی ہے۔ اور اس حالت میں بھی کہ وہ کھائی جا چکی ہے پانی اس کی کمک کو پہنچ رہا ہے" مچھلی کھانے کے بعد جو پیاس قدرتاً محسوس ہوتی ہے اسے پانی کی وفاداری کے ثبوت میں پیش کرنا خود شاعر کی قوتِ تخیلہ کا ثبوت ہے یہ دوہا ہندی کلام میں حسنِ تعلیل کی بہترین مثال ہے۔

(٨)

जब दांत न थे तब दूध दियो अब दांत दिये का अन्न न दे है।
जल में थल में पंछी पशु की सुध लेत - सो तेरी हू लौ है।
काहे को सोच करै मन मूरख सोच विचार करैं कछु हाथ न ऐहै।
जान को देत अजान को देत जहान को देत सो तऊ को दे है।

अन्न (اَن) = اناج	थल (تھل) = خشکی
पंछी (پنچھی) = پرند	पशु (پشو) = جانور
सुध (سُدھ) = خبر	मूरख (مورکھ) = بیوقوف

جب دانت نہ تھے تب دودھ دیو اب دانت دئے کا اَن نہ دے ہے؟
جل میں تھل میں پنچھی پشو کی سُدھ لیت سو تیری ہولی ہے!
کاہے کو سوچ کرے من مورکھ سوچ بچار کریں کچھو ہاتھ نہ آئے ہے!
جان کو دیت، اجان کو دیت جہاں کو دیت سو توُ کو دے ہے!

"جس وقت دانت نہیں تھے اس وقت تو نے (خدا نے) دودھ دیا تو اب کہ دانت دئے ہیں کیا غذا نہ دے گا؟ (اس کے کرم کی بدولت) چرند ہوں کہ پرند پانی اور خشکی میں چین پاتے ہیں، (ایسی صورتیں) تیری قسمت میں بھی سکھ لکھا ہے (اے سادہ لوح) کیوں خواہ مخواہ تو سوچ بچار کرتا ہے۔ بیوقوف ہی سوچتے ہیں، کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ جو جانداروں کو دیتا ہے بے جانوں کو دیتا ہے، سارے جہان کو دیتا ہے وہ تجھے بھی دے گا۔"

اس کبت کا آخری شعر لطافت زبان کے اعتبار سے گو اچھا ہے مگر اس کی تلقین قابل تردید ہے۔ ہندوستان کی ایک ثلث معاشی تباہی، فاقہ کشی اور محتاجی، مفلسی و ناداری کا باعث یہی ذہنیت ہے۔ اسی قناعت پسندی نے ہندوستان کو کھویا۔ یہی جھوٹی قناعت اور بیجا توکل، ہندوستانیوں کی سست کرداری، کاہلی اور عدم فعلیت کی ذمہ دار ہے۔ غیر محنتی ہمیشہ حیلہ جو ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں سینکڑوں، ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمی خدا پر بھروسہ کرنے کے بہانے سے دوسروں کے سہارے زندگی بسر کر رہے ہیں اور انہی

بوجھ سے محنتی لوگ تباہ حالت میں ہیں۔ ایک کماتا ہے تو دس کھاتے ہیں۔ جو دولت دس مل کر پیدا کرتے ہیں وہ سو میں تقسیم ہو جاتی ہے اور سو کی محنت کا ثمرہ ہزار میں بٹتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ کوئی بھی مرفہ الحال نہیں ہونے پاتا۔ اس کبت کا خصوصاً تیسرا پد۔

"کاہے کو سوچ کرے، من مورکھ سوچ بچار کریں کچھ ہاتھ نہ آئے ہے!" قابل تفریح اور ہندوستانیوں کی غیر معاشی ذہنیت کا بدیہی ثبوت ہے اوّل تو خود محنت نہ کریں دوسرے اپنی حالت کو بہتر بنانے کے خواہشمندوں کو بیوقوف ٹھہرائیں، پھر ساتھ ہی یہ قطعی حکم لگائیں کہ سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ غلطی پر غلطی، اس پر مزید غلطی ہے!!

یورپی اور امریکی معاشئین نے اس قول کی صحت ثابت کر دی ہے کہ "خداداد بے چینی" (Divine discontent) سے معاشی ترقی ہوتی ہے اور موجودہ حالات سے مطمئن رہنا انسداد ترقی کی پہلی نشانی اور معاشی تنزل کی پہلی وجہ ہے۔ ہمیں ایسے کلام کی سخت مخالفت کرنی چاہئے۔ جس سے ایمان میں اضافہ نہ ہو اور جو معاشی

ترقی کے اصول کے سراسر خلاف، گمراہ کن اور تباہ و برباد کرنے والا ہو۔ اس قسم کی نیم مذہبی وجدانیت نے قومی معاشیات کو سخت نقصان پہنچایا۔ اور اب بھی ہماری حالت کو بہتر بنانے میں خلل انداز ہوتی ہے۔ توکل، بھروسہ اور اعتماد انسان کے لئے اسی وقت شایان شان اور قابل تحسین ہے جب کہ اس نے اپنی حالت سدھارنے کے لئے پوری پوری کوشش کرلی ہو اور کوئی دقیقہ اپنی معاشی و عمرانی حالت کو سدھارنے کا فروگزاشت نہ کیا ہو۔ جب باوجود کوشش کے حالت درست نہ ہو تو انسان کے مایوس دل کو تقویت پہنچانے والا جذبہ توکل ہے۔ بغیر کوشش کئے توکل کرنا ایمان نہیں ہے، بلکہ کفر، ثواب نہیں ہے بلکہ عذاب کیونکہ دنیا کی ہر مذہبی کتاب میں یہ نصیحت آمیز قول موجود ہے کہ

"اللہ انہیں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہوں"

جس وقت میری نظر سے یہ بحث گزرا تھا اسی وقت میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ کاش کوئی کلام اسی مفہوم کا ایسا ملے جو دل کو بھی بھائے اور عقل کو بھی پسند آئے حسن اتفاق سمجھئے یا ثمرہ محنت کہ

تلسی داس کی مشہور و معروف ست سئی میں ایک دوہا ل گیا۔ جو اپنی جامعیت کے لحاظ سے قابل قدر و قابل تقلید ہے۔

---

(۹)

तुलसी अस्मय के सखा धीरज धर्म बिवेक।
साहस शील उदारता राम भरोसो एक॥

अस्मय (اسمئے) = براوقت　सखा (سکھا) = ساتھی
धीरज (دہیرج) = سنجیدگی　धर्म (دھرم) = ایمان
बिवेक (بیویک) = خیر و شر کی تمیز　साहस (ساہس) = خود اعتمادی
शील (شیل) = رحم دلی　उदारता (اودارتا) = دوسروں کا خیال، ہمدردی، فیاضی۔

تلسی اَسمئے کے سکھا، دہیرج، دھرم، بی ویک
ساہس، شیل، اُودارتا، رام بھروسو ایک

کہتا ہے "اے تلسی جب تجھ پر مصیبت پڑے تو تلاش حق، ایمانداری
سنجیدگی، خود اعتمادی رحم دلی اور ہمدردی سے کام لے اور سب سے
زیادہ خدا پر بھروسہ رکھ" مرفہ الحالی حاصل کرنے کی توقع، کامیاب ہونے
کی امید سب سے زیادہ اسی وقت ہوتی ہے جب کہ انسان کے دل
میں سکون، اطمینان اور امید فتح موجود ہو۔ معاشیات، مروجہ معاشیات
اِن روحانی قوتوں کی قائل نہیں جو اس کی تنگ نظری کا ثبوت ہے
جدید تحقیقات نے مذہب کے مفاد کو بخوبی پہچان لیا چنانچہ عمرانیات
میں مذہب کی اہمیت بحیثیت قوت تہذیب و شائستگی، بہبودی
اور مرفہ الحالی تسلیم کرلی گئی ہے۔ اطمینان قلب اور امید فتح سے کچھ
نہیں ہوتا۔ سومناتھ اور بیت المقدس محض اسی زائد اعتماد
کی وجہ سے علی الترتیب ہندوں اور مسلمانوں کے
ہاتھ سے جاتے رہے۔ اِس لئے یہ لازمی ہے کہ توکل کے ساتھ انسان
دفع مضرت کے لئے کوشش بھی کرے۔ بُرے وقتوں میں انسان پریشان
ہوجاتا ہے اور اکثر کوشش میں تنظیم باقی نہیں رہتی۔ لہذا تلسی داس کا
یہ مشورہ نہایت موزوں ہے کہ انسان کو جدوجہد کرتے وقت صبر و

استقلال، باضابطگی و ایمانداری سے کام لینا چاہئے۔

---

(۱۰)

یہ نفس انسانی کی کمزوری ہے کہ وہ کسی حقیقت کو بھی جو اس کے لئے باعث ذلت ہو تلخ سمجھ کر گوارا نہیں کر سکتا، ساتھ ہی وہ ذاتی وقار کو قائم رکھنے کے لئے دوسروں کی آبرو ریزی یا تقلیل عزت کا آرزومند ہے۔ انھیں دو نفسانی قوتوں کی باعث انسان میں تکبر اور عیب جوئی کی خصلتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک شخص دوسرے کو ذلیل ٹھیراتا ہے تو دوسرا پہلے کو اور زیادہ حقیر سمجھتا ہے اس باہمی تنازعہ کو شاعرانہ تمثیلات میں یوں ادا کیا گیا ہے۔

सौना कहे सुनार से कि उत्तम मेरी ज़ात ।
कार मुंह की घुंघची तुले हमारे साथ ॥
लालन के हम लाल हैं और लाल ही हमरो रंग ।
करया मुंह जब से भयो तुले नीच के संग ॥

उत्तम (اُتّم) = اعلیٰ   कारे (کارے) = کالے

घुंघची (گھونگھچی) = گنچی   भयो (بھیو) = ہوا

سونا کہے سنار سے کہ "اتم میری ذات، کارے منھ کی گھونگھچی تلے ہمارے ساتھ"
"لال کہے ہم لال ہیں اور لال ہمرو رنگ، کریا منھ جب ہے بھیو تلے نیچ کے سنگ!"

"سونا سنار سے کہتا ہے کہ میری ذات اعلیٰ ہے (اور کیا غضب ہے) کہ کالے منھ کی گنچی ہمارے ساتھ تولی جاتی ہے" اس تحقیر پر گنچی برافروختہ ہو کر کہتی ہے کہ "لالوں کے ہم لال ہیں اور ہمارا رنگ بھی لال ہے (ہمارا) منھ تو کالا اس وقت سے ہوا کہ ذلیل کے ساتھ تولے گئے"

ترکی بہ ترکی اسے کہتے ہیں۔

---

(۱۱)

कनक कनक तैं सौगुनी मादकता अधिकाय।
उहि खाये बौराय जग यह पाये बौराय ॥

कनक (کنک)= سونا (دھات) یا دھتورا (جس کے بیج کھانے سے انسان پاگل ہوجاتا ہے)   मादकता (مادکتا) = غرور

अधिकाय (ادھیکائے) = بڑھتا ہے

बौराय (بورائے) = پاگل ہوئے

کنک کنک تیں سو گونی مادکتا ادھیکائے
اوئے کھائے بورائے جگ یہ پائے بورائے

دھتورے سے سوگنا زیادہ سونے چاندی سے غرور میں اضافہ ہوتا ہے (یعنے سونے چاندی میں بہ نسبت دھتورے کے سوگنا پاگل کردینے والا زہر ہوتا ہے) اس کے کھانے سے دنیا پاگل بنتی ہے (تو) سونے کے پانے ہی سے پاگل ہوجاتی ہے۔"

انسانی فطرت میں نمونہ سازی (Idealization) کرنے والے حضرات کے لئے یہ حقیقت ہمیشہ تکلیف دہ رہی ہے کہ انسان دنیوی تعیشات اور نفسانی لذات کی خاطر اپنے اصول، قوانین تہذیب بلکہ ایمان کو بھی فراموش کر [illegible] کا [illegible] کی

محبت، شریفوں کی عزت اور شریف زادیوں کی عصمت دنیا میں بالعموم مقررہ داموں بکتی ہے۔ دنیا کی سیاسی، معاشی اور بالخصوص معاشرتی تاریخ میں سینکڑوں نہیں لاکھوں نہیں، بلکہ کروڑہا مثالیں ایسی ملیں گی کہ لوگوں نے عیش و آرام اور نام و نمود کی خاطر اپنی اولاد کو، اپنی عزت کو، اور اپنے مذہب کو، بالکل نظرانداز کر دیا۔

اس زمانہ میں بھی عزت، وقعت، حرمت اور اولاد جیسی "ہر لعزیز" چیزیں قابل فروخت اور قابل خرید ہیں۔ یہ ایک عام کلیہ ہے جس کی صحت مستثنیات سے غلط نہیں ثابت کی جا سکتی۔ ایک ہندوستانی فرمانروا کے حالات اس کے جرمانی مصاحب نے حال ہی میں لکھے ہیں وہ کہتا ہے کہ اس فرمانروا نے یورپ کے ایک دارالسلطنت میں ایک گل اندام رقاصہ کو دیکھا تو فوراً ہی اس پر گردیدہ ہو گیا اور اپنے جرمن مصاحب کو حکم دیا کہ اِس لڑکی کے والدین یا سرپرستوں سے لڑکی کی قیمت کا فیصلہ کرے جب اِس جرمن نے ڈرتے ڈرتے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا کہ "حضور ہندوستان کے کسی صوبہ یا دیسی ریاست میں نہیں [illegible] اور بیسویں صدی میں، وہ بھی یورپ کے ایک دارالسلطنت میں

یہ امر محال ہے" تو اس ہندوستانی فرمانروا نے حقارت سے ہنستے ہوئے کہا "یہاں بھی ہر چیز برائے فروخت ہے!"

لاچار عتاب شاہانہ کے خوف سے مجبور ہو کر اس جرمن نے اس نوعمر رقاصہ کے والدین سے گفت و شنید شروع کی۔ "میری حیرت" وہ بیان کرتا ہے "ناقابل اظہار تھی کہ اس لڑکی کے ماں باپ بھائی بہن بغیر چوں و چرا کئے بلا تکلف فوراً آمادہ ہو گئے۔ اور مثل ایک روزمرہ واقعہ کے قیمت کی بابت بحث کرنے لگے"(۱)

---

(۱) دیکھئے Ott. Maurer: "Zwanzig Jahre an indischen

सहजो जग में यूं रहे जिभया मुख है मांह,
घीउ घना भक्षन करै तो भी चिकनी नांह ॥

سہجو جگ میں یوں رہے جیوں جبھیا مکھ ماںھ
گھیو گھنا بھکشن کریں تو بھی چکنی ناںھ

مُکھ = منھ   ماںھ (ماںہ) میں

जिभया (جبھیا) = زبان   घीउ (گھیون) = گھی

घना (گھنا) = چکنا   भक्षन (بھکشن) = کھانا۔

"اے سہجو (شاعرہ کا تخلص ہے) دنیا میں ایسے گذر کر جیسے زبان منھ میں (گذر کرتی) ہے گاڑھا گھی کھاتی رہتی ہے مگر پھر بھی چکنی نہیں ہوجاتی (اور پاک صاف ہی رہتی ہے)"

یہ دوہا اس وجہ سے بھی قابل تعریف ہے کہ وہ ایک عورت کا کہا ہوا ہے ہندی میں کئی عورتیں شاعری میں ممتاز درجہ رکھتی ہیں مثلاً

واقعہ یہ ہے کہ بتیس دانتوں میں مثل زبان کے رہنا گو نہایت دشوار اور مشکل کام ہے تاہم معاشرت کے چین و آرام کے لئے یہ رائے نہایت موزوں اور بیشتر حالات میں قابل تقلید بھی ہے کہ دنیا میں زندگی صلح و امن میں گزاری جائے۔ دنیا میں جنگجو (اندرون خاندان یا معاشرت) اتنے پیدا ہوتے ہیں کہ واقعی صلح کل ہستیوں کی ہماری قوم کو بالخصوص سخت ضرورت ہے۔

دوسری بات جو متذکرہ بالا دوہے میں بیان کی گئی ہے وہ زبان کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اگرچہ گاڑھا گھی کھایا کرتی ہے مگر پھر بھی چکنی نہیں ہوتی۔ اور پاک وصاف ہی رہتی ہے۔ اسی طرح انسانوں کو چاہیئے کہ بالفرض بُری صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہو اور رذیلوں سے واسطہ پڑے پھر بھی خود رذیلوں کی طرح بیحیا اور چکنے نہ بن جائیں۔

تمثیل اگرچہ بالکل نئی ہے مگر ساتھ ہی بہت اچھی بھی نہیں اعتراض یہ ہے کہ گھی تو فی نفسہٖ بہت مفید، صحت بخش، مقوی غذا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ بات کسی بُری صحبت یا معاشرت میں نہیں پائی جاتی۔

(۱۳)

سہجو بائی کا ایک اور دوہا ہے جو لاجواب ہے۔ اس کی فہم رسا اور قوتِ مشاہدہ کی داد دینی چاہیئے کہ وہ ہندو معاشرت کے ایک ہمیشہ پیش آنے والے واقعہ کو کس رنگ میں اور کس پہلو سے ظاہر کرتی ہے۔

सीस कान मुख नासका ऊंचे ऊंचे नांव ।
सहजो नीचे कारने सब कोऊ पूजे पांव ॥

सीस (سیس)۔ سر   नासका (نا سِکا)۔ ناک

سیس، کان، مکھ، ناسکا، اونچے اونچے ناؤں
سہجو نیچے کارنے سب کوئی پوجیں پاؤں

"سر، کان، منہ، ناک، سب اونچے مقام پر ہیں اور چونکہ پاؤں نیچے ہیں اسی لئے ہر ایک انھیں پوجتا ہے"

انسان کے بدن ہی پر منحصر نہیں بلکہ دنیا کی ہر عضویت کا یہی حال ہے

اس کی مکمل صحت یا عمدگی کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کا ہر ایک
عضو فرداً فرداً باصحت اور مکمل ہو جس طرح مشینری کا ہر پرزہ مشینری
کے لئے یکساں ضروری ہے اسی طرح انسان کا ہر عضوِ بدن اپنی اپنی
جگہ یکساں مضبوط اور کارآمد ہے۔ یہ ہماری تنگ نظری یا بے خیالی
ہے کہ ہم آنکھ، دل یا دماغ کو دوسرے اعضائے بدن سے اہم تر سمجھتے
ہیں۔ انساں کا ایک ہاتھ یا پیر ضائع ہو جائے تو اس کی عضویت میں
لاعلاج خرابی نمودار ہو جاتی ہے اور بُری بھلی زندگی گذارنے پر وہ
مجبور ہو جاتا ہے پس ظاہر ہے کہ انسان کا ہر عضو بدن انسانی عضویت
کے لئے یکساں ضروری کارآمد اور اہم ہے۔

انسانی فطرت کی یہ نہایت عمدہ خصوصیت ہے کہ وہ دوسروں
میں انکسار کو پسند اور نمود کرنا پسند کرتی ہے، بڑے آدمیوں کی عظمت
اور بھی زیادہ ظاہر ہوتی ہے۔ جب کہ وہ منکسر المزاج ہوں اور گھمنڈ
و تکبر کی بد خصلتوں سے ان کا کردار پاک ہو۔ یہ ایک مانی ہوئی بات
ہے کہ ہر اس باکمال انسان کی قدر اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔ جس کی
طبیعت میں سادگی ہو اور نمود سے نفرت کرتا ہو اسی لئے شاعر نے

خوب کہا ہے کہ پاؤں کا لوگ اسی وجہ سے ادب کرتے ہیں کہ وہ نیچے ہوتے ہیں۔ اردو میں کسی شاعرہ کا کلام اس پایہ کا ملنا تو درکنار اس زبان میں سرے سے کسی قابل ذکر شاعرہ کا وجود ہی نہیں[ا]۔

---

(۱۴)

الم پرستی کو ہندوستانی شعراء نے اپنے نظام فلسفی کا ایک عنصر خاص بنا رکھا ہے اور اس پر جا بیجا؛ وقت، بیوقت؛ موقع بیموقع بھلے، برے؛ صحیح، غلط؛ غرض یہ کہ ہر طرح سے خیال آرائی کرتے رہے ہیں قنوطیت (Pessimism) مثل اردو و فارسی شاعری کے ہندی شاعری کی بڑی کمزوری ہے۔ یہ مرض اس قدر عام ہے کہ لوگ خوش رہنے کو گناہ اور خوشی سے زندگی بسر کرنے کو ایک ناممکن الحصول شئے سمجھنے لگے ہیں اور مسرت سے بچنے کے لئے نئے نئے طریقے اختیار کرتے ہیں۔ خیال تو کیجئے کہ ایک شاعرہ شادی بیاہ کے

---

(۱) اس کے ثبوت میں یہ کہنا کافی ہے کہ اردو ادب کی تواریخ (مثلاً آب حیات، مصنفہ محمد حسین آزاد یا "گل رعنا" مصنفہ عبدالحی صاحب مرحوم) میں کسی شاعرہ کا ذکر ہی نہیں۔

موقع پر کیا کہتی ہے۔

चलना है रहना नही चलना बिस्वे बीस ।
सहजो तनक सुहाग पर क्यों गुंघवावै सीस ॥

बिस्वेबीस (بسوے بیس) = یہاں بمعنی یقیناً، قطعی
सीस (سیس) = سر

چلنا ہے رہنا نہیں چلنا بسوے بیس
سہجو تنک سہاگ پر کیوں گندھوائے سیس

"دُنیا چل چلاؤ پر ہے۔ ٹھکانہ تو کہیں بھی نہیں سدا چلنا ہی ہے۔ اے سہجو۔ نئی سہاگن کی چوٹی کیوں گندھاتی ہو" (مطلب یہ ہے کہ یہ دو گھڑی کی زندگی ہے وہ یا تو خود مر جائے گی یا بہت جلد رانڈ ہو جائیگی چوٹی گندھانے سے کیا حاصل؟)

شاعر کا صحیح اور اعلیٰ مقصد زندگی یہی نہیں ہے کہ وہ گل و بلبل کی تعریف کرتا رہے یا یہ کہ قصیدہ خوانی یا ہزل گوئی میں مبتلا رہے۔

شاعر کا اعلیٰ مطمح نظر یہی ہے اور ہونا چاہیئے کہ وہ شاعری یعنی سحر نگاری کے ذریعہ قوم کو تربیت دے، اسے دینی اور دنیوی ترقی کرنے کے ڈھب سکھائے اور لوگوں کو اس قابل بنائے کہ وہ گزشتہ نسلوں سے بہتر زندگی بسر کریں اور آیندہ نسلوں کے لئے مرفہ الحالی کے زیادہ مواقع چھوڑ جائیں۔ جب شاعر اس کام کو انجام دیتا ہے تو وہ قوم و ملت کی اتنی ہی خدمت انجام دیتا ہے جس قدر کہ سلطنت کا بہترین عہدہ دار یا ملت کا سچا بہی خواہ!

جب شاعر اس راہ راست سے بہک جاتا ہے اور اپنے وجدانات، تنگ خیالیوں اور غلط اصول زندگی کو شاعری میں بیان کرتا ہے تو وہ قوم و ملت کو اسی قدر نقصان پہنچاتا ہے جس قدر کہ سلطنت کا کوئی بد دیانت، راشی عہدہ دار یا جماعت کا قوم فروش مصلح معاشرت!

اس سے زیادہ غلط تلقین اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم دنیا کو ہیچ سمجھیں، زندگی کو دو روزہ خیال کریں اور زیادہ سے زیادہ وقعت جو ہم اس عالم کو بخشیں تو اسے ایک سرائے سے تعبیر کریں "دنیائے فانی" کا خبط ہمارے دماغ پر سوار اور "عالم جاودانی" کا [illegible] ہو اور ہمارے

دلوں میں جاگزیں ہے۔ جس دنیا میں رہتے رہتے ہمیں کم ازکم پچاس ہزار برس گزر گئیں اور جس دینا کی تاریخی واقعات کا علم آج سے چھ ہزار سال بلکہ اِس سے قبل ہی سے ہمیں معلوم ہے اسے ''دو روزہ'' سمجھنا ہمارا بدترین عیب اور ہماری ناقابل عفو تقصیر ہے۔

ہر شئے میں ہر فعل میں، ہر شخص میں، ہر مصلحت میں اور ہر کام میں سیاہ ترین رخ کو سب سے زیادہ ملحوظ رکھنا مشرقی شعراء کا عام دستور رہا ہے اور افسوس ہے کہ ہندی شعراء کا دامن بھی اِس عیب سے پاک نہیں۔ مذہبی اعتبار سے دیکھا جائے تب بھی یہ گناہ کبیرہ ہے کہ جس دنیا میں ہماری راحت و آرام کے اس قدر اسباب موجود اور مرفہ الحالی و خوشحالی کے لئے غیر محدود ذرائع فراہم ہوں، ہم یوں بسر کریں کہ گویا زندگی روگ، خوش رہنا، عیب اور راحت و مرفہ الحالی گناہ ہے۔ یہ کفران نعمت نہیں تو پھر کیا ہے کہ جس خالق کے متعلق ہم یہ کہیں کہ وہ اپنے بندوں کو ایسا ہی چاہتا ہے جیسے انسان اپنی اولاد کو چاہتا ہے اسی کی خلق کردہ دنیا کو ہیچ سمجھیں اور جس خدا کی تعریف کریں اور حمد و ثناء میں مصروف

ادا کریں اور اسی زبان سے دنیا کی تذلیل کریں۔

جس قدر نقصان ہماری سیاہ بینی نے ملک و ملّت کی اقتصادی حالت کو پہنچایا ہے۔ اس کا اندازہ کرنے میں مبالغہ کا بہت کم اندیشہ ہے۔ کیونکہ ہماری فہم عقل و ذہن، تینوں کے تینوں قنوطیت، الم پرستی اور سیاہ بینی کے نذر ہو کر انھیں پر بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔

---

(۱۵)

बेचूं खोटे दाम सों मिटे जीव की हान,
बलहारी सोना कीजिये जासों टूटे कान ॥

जीव (جیو) = زندگی हान (ہان) = نقصان
बलहारी (بلہاری) = تصدق

بیچوں کھوٹے دام سوں مٹے جیو کی ہان
بلہاری سونا کیجئے جا سوں ٹوٹے کان

"جس چیز سے دل کو تکلیف پہنچتی ہو اسے کھوٹے داموں بیچ دو۔ ایسے سونے کو صدقہ کر دینا چاہیئے جس سے کان ٹوٹیں"۔ یہ اسی ضرب المثل کی ترجمانی ہے جو اردو میں بھی بہت عام ہے۔

پُھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان

---

(۱۶)

आलस नींद किसानै खोवै चोरै खोवै खांसी ।
हंसी मसखरी साधै खोवै ब्रह्मन खोवै दासी ॥

آلس (آلس) = سستی

آلس نیند کِسانے کھوئے چورے کھوئے کھانسی
ہنسی مسخری سادھے کھوئے برہمن کھوئے داسی

"کاہلی سے کسان برباد ہوتا ہے اور چور کھانسی سے پکڑا جاتا ہے سادھو کی عزت ہنسی مسخری سے جاتی ہے اور برہمن کا عورت ہی سے

ستیاناس ہوتا ہے۔

---

(۱۷)

रहिमन धागा प्रेम का जिन तोड़ौ झटकाय,
टूटे से फिर ना जुरे जुरे गांठ पर जाय॥

رحمن دھاگا پریم کا جن توڑو جھٹکائے
ٹوٹے سین پھر نہ جڑے جُڑے گانٹھ پڑ جائے

"اے رحمن رشتۂ محبت کو جھٹک کر نہ توڑ دے (اول تو) ٹوٹنے سے (بمشکل) جڑتا ہے اور جڑ بھی جائے تو اس میں گانٹھ پڑ جاتی ہے۔"

---

(۱۸)

रहिमन पानी राखये बिन पानी सब सून।
पानी गये न ऊबरे मोती मानस चून॥

رحمٰن پانی راکھیو، بن پانی سب سون
پانی گئے نہ اوبرے موتی مانس چون

اُے رحمٰن (دنیا میں) عزت سے گذر کر (آنکھ کا پانی نہ سرنے دے) (کیونکہ) بغیر پانی کے سب بیکار ہے (دیکھ کہ کس طرح) پانی جانے سے موتی، انسان اور چونا ابھرتا ہی نہیں "پانی" کا لفظ تین معنوں میں مستعمل ہوا ہے یعنے موتی کے لئے رونق۔ انسان کے لئے حیا و غیرت اور چونے کے لئے آب۔

(۱۹)

मन मोती उर दूध रस इन के यही सुभाव।
फाटे से फिर ना मिलें कोटन करौ उपाव॥

सुभाव (سبھاؤ) = طریقہ کوटन (کوٹن) = کروروں

من، موتی، اور دودھ رس ان کے ہی سبھاؤ
پھاٹے سے پھر نا ملیں، کوٹن کرو اُپاؤ

"دل، موتی، اور دودھ۔ ان تینوں کی ایک سی حالت ہے ایک مرتبہ پھٹ جانے سے پھر نہیں ملتے۔ چاہے انسان سینکڑوں طریقے ہی کیوں نہ اختیار کرے"۔

(۲۰)

सर सूखे पंछी उड़ें और सरन समाहिं।
दीन मीन बिन पच्छ के कहु रहीम कहँ जाहिं॥

पच्छ (پچھی) = پرندے، सरन (سرنٹر) = تالاب،
मीन (مین) = مچھلی دीन (دین) = غریب

جل سوکھے، پنچھی اڑیں، اورسے سرن سمائیں
دین میں بن پچھ کی، کہو رحیم کہنہ جائیں؟

"پانی سوکھتے ہی پرندے اڑ کر دوسرے تالاب پر چلے جاتے ہیں۔ اے رحیم بتا کہ غریب مچھلیاں کہاں جائیں۔ جن میں اڑنے کی طاقت نہیں ہے؟"

ہندوستان، مصیبت زدہ، ستم رسیدہ، مفلس و محتاج ہندوستان کے لاکھوں، کروروں باشندوں پر یہ دوہا تمام تر صادق آتا ہے۔ حشر ظاہر ہے انھیں مچھلیوں کا سا ہوتا ہے۔ بے آب ودانہ کس کی گزر

ہو سکتی ہے؟

---

(۲۱)

फ़रजी शाह न होसके गत टेढ़ो तासीर ।
रहमन सीधी चालसे प्यादा होत वजीर ॥

فرزی شاہ نہ ہو سکے۔ گت ٹھیڑی تاثیر
رحمن سیدھی چال سے پیادا ہوت وزیر

عبدالرحیم خانخاناں کا مشہور دوہا ہے جس میں اس عام **sentiment** کو ظاہر کیا ہے کہ راست بازی و نیک چلنی سے انسان ترقی کرتا ہے اور فریب و مکاری سے یعنی ٹھیڑی چال چلنے سے ترقی ناممکن ہے۔ چنانچہ کہتا ہے "فرزی شاہ نہیں ہو سکتا یہ اس کی ٹھیڑی چال کا اثر ہے اے رحمن سیدھی چال سے پیادہ وزیر ہو جاتا ہے!" اس میں کوئی شک نہیں کہ خانخاناں نے مثال بہت دلفریب دی ہے

شاعر کی داد دینے کو بیساختہ جی چاہتا ہے مگر حقیقتِ حال کچھ اور ہی ہے ترقی کی راہیں اکثر و بیشتر انھیں لوگوں کے لئے کھلی نظر آتی ہیں جو موقع شناس اور مصلحت بیں ہوں اور ہر حال میں استفادہ کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہوں وہ لوگ ترقی نہیں کرتے جو صرف ٹیڑھی چالیں چلتے ہیں اور وہ بھی لازمی طور پر بلندی تک نہیں پہونچتے جو سیدھے راستہ پر گامزن ہوں۔ سچ پوچھئے تو ترقی کے اسباب صحیح طور پر دریافت نہیں کئے گئے۔ لوگوں نے ترقی کے وجوہ و علل پر اب تک بہت کم تحقیقات کی۔ عام مشاہدہ تو یہ ہے کہ دنیوی ترقی تو وہی کر رہے ہیں جو زیادہ تر ٹیڑھے راستے چلتے یا کم از کم جو اپنے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے حسب موقع سیدھا، ترچھا، اونچا، نیچا راستہ اختیار کرتے ہوں۔ نہ صرف یہ بلکہ جب ان کی منفعت اسی میں ہوتی ہے تو وہ الٹا راستہ بھی اختیار کرتے ہیں۔ دنیوی تختۂ زندگی پر پیادے و فرزی کی چالیں وہی نہیں ہوتیں جو شطرنج میں ہوتی ہیں اور نہ اُن کے نتائج وہی ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ مثال گو دلفریب ہے مگر صحیح نہیں۔

(۲۲)

عروج و زوال، ترقی و تنزل، کامیابی و ناکامی دنیا میں جس قدر اور جس طرح نمودار ہوتی ہیں اس کے متعلق کبیر داس نے ایک لاجواب ساکھی (دوہے کی ایک قسم ہے) لکھی ہے۔

सांचे कोई न पतीजिई झूटे जग पतियाय ।
गली गली गोरस फिरै मदिरा बैठ बिकाय ॥

पतीजिई (پتیجئے)۔ قدر کرے یا اعتبار کرے پतयाय (پتیائے)۔ باور کرے۔ गोरस (گورس)۔ دودھ

मदिरा (مدیرا)۔ شراب۔

سانچے کوئی نہ پتیجئے، جھوٹے جگ پتیائے
گلی گلی گورس پھرے، مدیرا بیٹھ بکائے

(بالعموم) سچے آدمی کی قدر بہت کم ہوتی ہے، جھوٹے آدمی اپنی لفاظی کی بدولت، قابل اعتماد تصور کئے جاتے ہیں۔ دودھ

(اُس وقت فروخت ہوتا ہے جب کہ وہ) گلی گلی پھرتا ہے اور شراب (شراب خانہ ہی پر) بکتی ہے۔"

جس قدر یہ ساکھی بادیٔ النظر میں غلط معلوم ہوتی ہے اُسی قدر حقیقت حال کا اگر لحاظ کیا جائے تو صحیح ہے۔ شاہی درباروں میں امراؤ رؤسا کے دوست احباب میں اور سلطنت کے عہدہ داروں میں بالعموم ایسے لوگوں کو اپنی قدر و منزلت کے لئے سب سے زیادہ کاوش و جانفشانی کرنی پڑتی ہے جو مقابلتًہ سب سے زیادہ ایماندار، محنتی، جفاکش اور عقلمند ہوتے ہیں اور برعکس ان کے جعلساز، ریاکار فریبی لوگ جو منہ چڑھے ہوتے ہیں۔ وہ اسی طرح اپنے حاکم کو محکوم کر لیتے ہیں جس طرح کہ منشیات نفس انسانی کو تسخیر کرتی ہیں۔ آج کل بھی وہی لوگ زیادہ تر معتوبین میں شمار کئے جاتے ہیں جو صداقت و خلوص، سچائی و نیک چلنی سے خدمات انجام دے رہے ہیں، اور جو لوگ جھوٹ موٹ باتیں بنائے پھرتے ہیں، اپنے حاکم یا سرپرست کے ہر فعل و کلام پر مرحبا و تحسین کے نعرے لگاتے ہیں اور دل کھول کر ان کی مدح سرائی میں مصروف ہیں انھیں گھر بیٹھے دھن دولت عزت و آبرو سب ہی

میسر ہے۔

---

(۲۳)

दुख में सुमरण सब करें सुःख में करै न कोय।
सुःख में जो सुमरण करें दुःख काहे को होय॥

सुमरण (سُمرن) = عبادت

دُکھ میں سُمرن سب کریں، سکھ میں کرے نہ کوئے
سُکھ میں جو سُمرن کریں، دکھ کاہے کو ہوئے

یہ دوہا ہندوستانی بلکہ مشرقی ممالک کی مستورات کو بہت پسند آئے گا کیونکہ اس میں زیادہ تر انھیں کے خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے تکلیف میں ہر ایک اللہ کو یاد کرتا ہے اور راحت (کے زمانے میں) کوئی بھی (خدا کو) یاد نہیں کرتا۔ اگر ہم آرام کے زمانے میں بھی یاد کیا کریں تو دکھ کاہے کو ہو؟

तुलसी तीनों लोक में   को जाने पर पीर,
या जाने मन आपना   या जाने रघुबीर॥

تلسی تینوں لوک میں کوٗ جانے پر پیر؟
یا جانے من آپنا یا جانے رگھو بیر!

लोक (لوک) = دنیا، पर (پر) = دوسروں کا
पीर (پیر) = درد، تکلیف मन (من) = دل
रघुबीर (رگھو بیر) = خدا

"اے تلسی ان تینوں دنیاؤں میں (اہل ہندو کے وشنیات کے مطابق کائنات میں تین عالم ہیں) کون کسی غیر کے درد کا اندازہ کر سکتا ہے؟ (جواب میں شاعر کہتا ہے) یا تو انسان کا دل ہی جانتا ہے یا نہیں تو خدائے تعالیٰ!" ہر شخص پر جب مصیبت پڑتی ہے تو جو حالت اس کے دل و دماغ کی ہوتی ہے جن تکالیف کا اُسے سامنا کرنا پڑتا ہے

اور جن مجبوریوں میں وہ گھرا رہتا ہے اس کا صحیح حال اِس شخص کے سوا کسی اور حتیٰ کہ اس کے راز دار کو بھی معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ کوئی شخص بھی اپنے دل کا پورا پورا راز مطلقاً و کلیتاً دوسروں سے نہیں کہتا۔ اور جو کچھ اس کے دل پر گزرتی ہے اس کا صحیح اندازہ مصیبت زدہ کے قریب ترین رشتہ دار یا راز دار بھی نہیں کر سکتے۔ یہ مفہوم دوہے کے پہلے مصرعہ میں ادا کیا گیا، پھر بھی دوہے میں کوئی خاص قابل تعریف بات نہیں پائی جاتی، ایک سیدھی سادھی بات تھی جو معمولی الفاظ میں ادا کر دی گئی۔

---

(۲۵)

तुलसी यह संसार में   रहये सभी मिलाय।
मिलैं सिंघ मारै नहीं   अनमिल मारै गाय॥

تُلسی یہ سنسار میں، رہیئے سبھی ملائے
ملیں سینگھ مارے نہیں، انمِل مارے گائے

اتحاد پسندی کی تعلیم اور اتفاق و یکجہتی کی تدریس اسی پرانے ڈھنگ میں کی ہے جو اگرچہ صدیوں قدیم ہے پھر بھی جس کا اثر نہیں ضائع ہونے پایا کیونکہ وہ روگ بھی جس کا علاج اتفاق ہے، اب تک رفع نہیں ہوا۔ جب تک زخم اور درد رہتا ہے اس وقت تک اس درد کے دوا کو کوئی غیر اہم نہیں سمجھتا۔ یہی وجہ ہے کہ تلسی داس کا یہ کہنا آج بھی ہمارے لئے محتاج عمل ہے "کہ سب سے میل ملاپ رکھو کیونکہ اتفاق کی صورت میں شیر بھی حملہ نہیں کرتا اور پھوٹ کی حالت میں گائے بھی حملہ کر بیٹھتی ہے۔"

---

(۲۶)

अमी पियावै मानबिन रहमन मुइ न सुहाय।
मानसहित मरबो भलो बरु बिष देइ बुलाय ॥

अमी (امی) = آبحیات　　बिष (بس) = زہر

آمی پیارے مان بن، رحمن موئی نہ سوہائے
مان سہت مر بو بہلو، بر بس دے بولائے

"اے رحمٰن مجھے وہ آبحیات پسند نہیں آتا جو بے عزتی سے دیا جائے اور میں تو اس زہر کو بہتر سمجھتا ہوں جو عزت کے ساتھ پیش کیا جائے۔"

---

(۲۷)

नानक नन्हा होरहो जैसी नन्ही दूब ।
सबै घास चर जांयगी दूब खूब की खूब ॥

दूब (دوب) = گھاس

نانک ننھا ہو رہو جیسی ننھی دوب
سبئے گھاس چر جائیں گی دوب خوب کی خوب!

والے نانک دنیا میں مثل گیاکے رہ۔ مویشی آکر گھاس کھا لیتے ہیں مگر پھر بھی جڑیں بدستور سلامت رہتی ہیں۔"

واقعہ بھی یہ ہے کہ دنیا میں بمقابلہ مغرور و شیخی خور انسانوں کے سیدھے سادے انسانوں کا گزر زیادہ سکون و راحت سے ہو جاتا ہے

---

(۲۸)

रूखी सूखी खाय के ठनडा पानी पी ।
देख पराई चूपरी जिन ललचावो जी ॥

چُپری (چوپڑی)۔ روٹی، غذا۔

رُوکھی سُوکھی کھائے کے ٹھنڈا پانی پی
دیکھ پرائی چوپری، جِن للچاؤ جی

"روکھا سوکھا کر ٹھنڈا پانی پی لے دوسروں کی روٹی دیکھ کر جی للچائے

(٣٩)

आगे के दिन पाछे गये हरी सें किया न हेत ।
अब पछताये होत क्या जब चिड़ियां चुग गई खेत ॥

آگے کے دن پاچھے گئے ہری سے کیو نہ ہیت
اب پچھتاوے ہوت کیا جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

دوہے کا مطلب صاف ہے۔ جس کا دوسرا مصرعہ اردو میں
بہت عام ہے۔ وقت کے گزر جانے کے بعد جدوجہد کی بے سودی کو
مثال نے خوب واضح کیا ہے۔ نظر کے سامنے وہ سماں پھر جاتا ہے
جب سینکڑوں چڑیاں کھیت سے دانے چن چگ کر کچھ اپنے
اپنے بسیروں کی طرف کچھ آسمان کی طرف روانہ ہو جاتی ہیں۔

---

(۳۰)

कबीर आप ठगाइये और न ठगिये कोय।
आप ठगे सुख ऊपजै और ठगे दुःख होय॥

کبیر آپ ٹھگائیے، اور نہ ٹھگئے کوئے
آپ ٹھگے سُکھ اُوپجے اور ٹھگے دُکھ ہوئے

"خود تو دوسروں کو فریب دیں مگر کوئی دوسرا ہمیں نہ ٹھگے۔
جب ہم خود فریب دیتے ہیں تو خوشی ہوتی ہے اور جب دوسرا
فریب دیتا ہے تو تکلیف ہوتی ہے۔"

خود غرضی کی خصلت نے انسان کی فطرت و کردار میں عجیب
دو رنگی خصوصیتیں پیدا کی ہیں۔ ایک ہی چیز جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے
وہ دوسروں کے لئے اُسے ناپسندیدہ ہیں یہی نہیں بلکہ دوسروں کی
جو عادتیں اسے ناگوار گزرتی ہیں وہ خود اپنے لئے روا رکھتا ہے۔ بیشتر

برائیوں کی جڑ، ہزارہا خرابیوں کا سبب، اکثر عیوب کی وجہ یہی خودغرضی ہے۔ اگر انسان خودغرض نہ ہوتا تو جھوٹ، چوری، خون سے لے کر مکاری، فریب، دغابازی، بددیانتی دنیا میں نامعلوم خصلتیں ہوتیں۔ یہ سب ضمنی برائیاں ہیں، زیادہ تر انسان جھوٹ جھوٹ کی خاطر نہیں بولتا بلکہ جھوٹ ایک ذریعہ اس کی خودغرضانہ مقصد کے حاصل کرنے کا ہے۔ اسی طرح اکثر قتل، خون کی خاطر نہیں بلکہ کسی خودغرضی کی وجہ سے کئے جاتے ہیں۔

جس طرح انسان خودغرضی سے، یعنی جب اس کی منفعت پنہاں ہوتی ہے، انصاف پسند، قوم پرست، ملک کا شیدائی، حرّیت و آزادی کا فدائی بن جاتا ہے۔ اسی طرح جب منفعت ظلم و تشدد میں مضمر ہوتی ہے تو ناانصافی و عدم پابندی اصول اس کے کردار کے رہنما ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب مغلوں نے ظلم کئے تو انھیں اپنی بدافعالی کا احساس بھی نہ ہوا۔ مگر جب انگریزوں نے ان کے ساتھ تشدد برتا تو وہ ہائے دھوکہ! دھوکہ! چلا اٹھے۔ جب تک ہندوستانی صنعتوں کی

تجارت کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہ کی مگر جب جرمانیہ وجاپان
ہندوستانی بازاروں میں شریکوں کی حیثیت سے قابض ہونے لگے تو
فوراً آئین تجارت اور ساتھ ہی شاہی ترجیح کا پسندیدہ اصول سامنے
کردیا گیا۔ ۱۸۷۱ء۔۱۸۷۰ء میں سول اور فوجی حکام نے نہیں بلکہ متوسط اور ادنی درجہ
کے جرمن افسروں نے جس بے دردی و حقارت سے فرانسیسی آبادی کے
ساتھ سلوک کیا اس کا بدلہ فرانسیسیوں نے اور بھی زیادہ تنگ دلی اور کینہ
پروری سے ۱۹۱۸ء۔۲۴ء میں متواتر چھ سال تک لیا۔ اُس وقت فرانس سے
ہزار حیلہ بہانوں سے رقم وصول کی گئی تھی تو اب فرانس نے اِس سے
دوچند رقم فریب و مکاری سے جرمانیہ سے حاصل کرلی۔ غرض یہ کہ ظلم و
تشدد کا ایک طرف اور ریاکاری و بناوٹ کا دوسری جانب ایک سلسلہ
ہے کہ ختم ہی نہیں ہونے پاتا عیوب و جرائم نصف محیطیں ہیں جو ملکر ایک
دائرہ بن جاتی ہیں جس کی ظاہر ہے کہ نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا۔ ایک چکر ہے
کہ دنیا کے ساتھ ساتھ گھوم رہا ہے۔

یہ دوہا جس کا لطف سب سے زیادہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے
جب کہ تیسرا ٹکڑا (آپ ٹھگے سکھ اوپجیے) طعن آمیز لہجے میں

پڑھا جائے) بنی نوع کی خود غرضانہ ذہنیت کی ایسی حقیقی تصویر ہے کہ اس سے بہتر کم از کم جہاں تک کہ خود غرضی کا تعلق ہے بعید از قیاس ہے۔

---

(۳۱)

कथनी मीठी खांड सी करनी विष की लोय।
कथनी तज करनी करै तो विष से अमृत होय॥

कथनी (کتھنی) = گفتگو — लोय (لوئے) = مطابق
तज (تج) = چھوڑ — अमृत (امرت) = آبحیات

کتھنی میٹھی کھانڈ سی، کرنی بس کی لوئے
کتھنی تج کرنی کرے، تو بس سے امرت ہوئے

انسان کو غرور، شیخی، گپ شپ اور باتیں بنانے میں خوب لطف آتا ہے جہاں کہیں جائیے آپ ہمیشہ ایسے لوگوں کی کثرت پائیں گے جو

ہاکتے تو بہت کچھ ہیں مگر کرتے کچھ نہیں اصول بیان کرنے میں، پالیسی کے قائم کرنے میں، بے تکی لفاظی میں، ایک سے ایک بڑھ کر ملتا ہے تو سنجیدگی و متانت، مستقل مزاجی و اعلیٰ ہمتی سے کام کرنے والے شاذ و نادر ہی پائے جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ فطرتاً انسان باتونی واقع ہوا ہے اور اسے اپنی زبان چلاتے رہنے میں ایک خاص لطف آتا ہے اس کے برعکس کام کاج کرنے کے لئے اسے اپنے جسم و نفس دونوں کو مجبور کرنا پڑتا ہے۔ اور اس کی طبیعت (تا وقتیکہ وہ کام کی عادی نہ ہو جائے) ہر قسم کے کام سے الجھتی ہے اسی لئے کبیر داس نے اس ساکھی میں صحیح کہا ہے کہ "باتیں بنانا مثل شکر کی کھانڈ کے میٹھا ہے، (نفس کے لئے) کام کرنا زہر کے مطابق ہے باتیں بنانا چھوڑ کر کام شروع کرو تو زہر سے آبحیات پیدا ہو۔"

محنت کی قدر و قیمت ظاہر کرنے کے لئے، فعلیت کی تلقین اور عملیت پر اصرار کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی اور تشبیہ نہیں مل سکتی۔ "محنت زہر سے بھی آبحیات پیدا کر سکتی ہے"۔ استعارہ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو بالکل صحیح ہے محنت ... [illegible]

اور جن ظاہرہ "ناممکن" چیزوں کو ممکن کر دکھایا ہے وہ واقعی اس تشبیہ کی مستحق ہے۔ کہ اس نے زہر سے آبحیات پیدا کیا۔ اول تو پانی سے آبحیات بنانا ہی ایک دشوار کام تھا چہ جائیکہ زہر سے آبحیات بنانا پڑ رہا ہے مگر یہ کام بھی سہل ہے بشرطیکہ انسان محنت کرے۔ ہمعصر ماہرین معاشیات جو "سرمایہ" کو اہم ترین عامل پیدائش قرار دیتے ہیں اور ہمارے ملک کی معاشی ابتری کا راز "سرمایہ" کی "کمی" بتلاتے ہیں کبیر جیسے "غیر معاشی" انسان سے عبرت حاصل کریں!

ویرانوں کو گلشنوں میں تبدیل کرنے والی فاقہ کشوں کو مرفہ الحال اور حرماں نصیبوں کو خوشحال بنانے والی چیز محنت ہے جس کی اہمیت کے اندازہ کرنے میں اب بھی بہت سے "علماء معاشیات" کوتاہی کرتے ہیں۔

جو لوگ ترقی یافتہ ممالک کے عروج کا اصلی حال جانتے اور تسلیم کرتے ہیں کہ سرمایہ کی کمی محنت و تنظیم کی کمی ہے وہی اس تمثیل کی خوبی کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ محنت کیونکر زہر سے آبحیات تیار کر سکتی ہے۔

(۳۲)

"ان کی باتیں مجھے زہر معلوم ہوتی ہیں" اکثر ان لوگوں کے متعلق کہا جاتا ہے جنھیں نصیحت دینے کا تلخ کام انجام دینا پڑتا ہے۔ ان لوگوں کا ذکر نہ بھی ہو جو پیشہ ور ناصح بنے بیٹھے ہیں (مثلاً رہبران دین، ملا وغیرہ یا جو محض عیب جوئی کی خاطر ڈھونڈھ ڈھونڈہ کر عیوب کا پتہ چلاتے اور نصیحت کے بہانہ بیان کرتے ہیں (تاکہ تشہیر عیوب میں سہولت ہو اور بہانہ بھی ملے) تب بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض مرتبہ واقعی جب خلوص سے، سچائی سے ایمانداری سے، اور دوسروں ہی کے فائدے کے لئے نصیحت کی جاتی ہے۔ تب بھی سننے والے کو یہ نصیحت تلخ معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ ناصح سے بدظن و بدگمان ہو جاتا ہے ہم جنھیں نصیحت کرتے ہیں عیب جوئی کی خاطر نہیں، تفنن طبع کے لئے نہیں بلکہ خیر خواہی کی خاطر (وہ بھی سچے دل سے اور فرط محبت (جس میں دوسروں کی بھلائی کے خیال کا موجود ہونا لازمی ہوتا ہے) سے مجبور ہو کر) انھیں بھی نصیحت ناگوار ہوتی ہے مگر بغیر اس کے کوئی چارہ بھی نہیں۔ اپنے کسی رشتہ دار یا دوست کو کوئی شخص (خصوصاً جب کہ اسے اپنے رشتہ دار یا دوست سے

غیر معمولی انسیت و محبت ہو) غلط راہ پر چلتا ہوا نہیں دیکھ سکتا جذبہ
محبت ہی اِسے مجبور کرتا ہے کہ وہ ہدایت کرے نصیحت کرے اور
حتی المقدور اپنے رشتہ دار یا دوست کو تباہی سے روکنے کی کوشش کرے
یہ دنیائے محبت کا عجیب قانون ہے کہ جس قدر جس شخص سے انسان کو
محبت ہوتی ہے اتنی ہی اس شخص کی مصیبتوں، غلط کاریوں سے اسے
دل آزاری ہوتی ہے اور جس قدر اُسے محبت ہوتی ہے اسی قدر وہ
اپنے دوست یا عزیز کو حال و مستقبل کی آفتوں سے بچانا چاہتا ہے۔

ان قوانین محبت کے ہاتھوں انسان نے کیا کیا مصیبتیں جھیلیں،
کن کن آفتوں کا سامنا کیا اور کیسی کیسی سخت ترین اور ناقابل بیان روحانی
تکلیفیں برداشت کیں اس کا حال تھوڑا بہت تاریخ عالم میں بھی ملتا ہے
اور لوگوں کی سوانح عمریاں پڑھنے سے بھی معلوم ہو سکتا ہے سچ پوچھئے تو
اس چھان بین کی ضرورت ہی کیا ہے؟ سچے۔ پرخلوص محبت کرنیوالے
اپنے دلوں سے پوچھئیں کہ انھوں نے محض دوسروں کی نیکنامی اور
خوشحالی کے لئے کیا کیا؟ اپنے آپ کو تباہ کیا تاکہ دوسرے آباد رہیں!
اپنی حسرتوں کو قربان کیا تاکہ دوسرے نیکنام رہیں!

اس قدر ایثار کرنے والے ہر طرح اپنے عزیز دوستوں اور رشتہ داروں کو آفتوں سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں جس کا سہل ترین طریق یہ ہے کہ انسان سہولت سے موقع پر نصیحت کرے۔ نصیحت کی ضرورت و اہمیت کو ہندی زبان کے غالباً بہترین اخلاقی نظمیں کہنے والے شاعر "ورند" نے خوب ظاہر کیا ہے۔

बुरे लगत सिख के बचन हिये बिचारो आप।
करुवी भेषज बिन पिये मिटै न तन को ताप॥

हिये (ہیئے) = دل میں बिचारो (بچارو) = سوچ لو
सिख (سکھ) = ناصح भेषज (بھیشج) = دوا

بُرے لگت سِکھ کے بچن، ہیئے بچارو آپ
کروی بھیشج بِن پیئے، مٹے نہ تن کی تاپ

"دل میں غور کر کے دیکھ لو کہ ناصح کی باتیں کیسی بری لگتی ہیں (مگر بغیر ان کے چارہ ہی کیا ہے) کڑوی دوا پیئے بغیر (رہی تو) جسم کا بخار نہیں اترتا"

کڑوی دوا کو نصیحت سے اور کڑوی دوا کے فائدہ کو تحصیل صحت سے
تشبیہ دے کر ورند نے نصیحت کی اہمیت و ضرورت کو جس طرح ایک
دوہے کے ذریعے ذہن نشین کر دیا ہے اسی طرح واضح کرنے کے لئے
ایک قادر الکلام مقرر کو ایک پوری تقریر کی، اور ایک عمدہ نثر نگار کو ایک
مکمل مضمون کی ضرورت ہوگی۔

---

(۳۳)

देखो करनी कमल की   कीनों जल सों हेत ।
प्राण तज्यो प्रेम न तज्यो   सुख्यो सरहि समेत ॥

हेत (ہیت) = محبت   प्राण (پرانڑ) = جان

सरहि (سرہین) = تالاب

دیکھو کرنی کمل کی، کینوں جل سوں ہیت
پرانڑ تجیو پریم نہ تجیو، سوکھیو سرہین سمیت

"کنول کے (طرزِ محبت) کو دیکھئے کہ پانی سے (کس طرح) محبت کرتا ہے (کنول) جان دیدیتا ہے مگر محبت نہیں جاتی (اور) سوکھتا بھی ہے تو تالاب کے ساتھ ہی (خشک ہوتا ہے)"۔

کہا جاتا ہے کہ کنول کے درخت جس تالاب میں ہوتے ہیں وہ ہمیشہ قائم رہتے ہیں۔ وہ سوکھتے جبھی ہیں جب کہ خود تالاب کا پانی سوکھ جائے۔

---

(۳۴)

सांचे को सांचा मिलै   अधिक बढ़े सनेह

झूठे को सांचा मिलै   तड़दे टूटे नेह ॥

आधिक (آدھک) = زیادہ   सनेह (سنیہ) = محبت

سانچے کو سانچا ملے، آدھک بڑھے سنیہ

جھوٹے کو سانچا ملے، تڑدے ٹوٹے نیہ

یہ عام مشاہدہ کی بات ہے کہ شریف کی شریفوں ہی میں گذر
ہو سکتی ہے۔ اور جب کبھی رذیلوں سے پالا پڑتا ہے تو نباہ ناممکن
ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کو سیدھے سادھے الفاظ میں کبیرداس نے
اس طرح سے بیان کیا ہے کہ "سچے کو اگر سچا ملجائے تو محبت اور زیادہ
بڑھے گی اور جھوٹے کو اگر سچا ملے گا تو تڑ سے محبت ٹوٹ جائے گی"

---

(۳۵)

आवत ही हर्ष नही नैनन न ही सनेह।
तुलसी तहां न जाइये कंचन बर सै मेह ॥

हर्ष (ہرشے) = خوشی، कंचन (کنچن) = سونا

آوت ہی ہرشے نہیں نینن نہیں سنیہہ
تلسی تہاں نہ جائیے کنچن برسے میہہ

(تمھارے) آنے سے خوشی نہیں ہوتی اور نہ آنکھوں میں محبت ہے

(یعنے یہ کہ محبت بھری آنکھیں تمہارا استقبال نہیں کرتیں)؛ اسے تلسی داس ایسی جگہ نہ جائے۔ چاہے وہاں آب زر (ہی کیوں نہ) برسے"۔

آداب ملاقات میں دو چیزوں کو بہت دخل ہے۔ اولاً خلوص دوسرے ظاہرداری۔ وہ لوگ جو میل ملاپ میں خلوص کے قائل ہیں بجا طور پر خیال کرتے ہیں اور ان کا یہ مطمح نظر بالکل صحیح ہے کہ:۔

"It is much better to be an uninvited welcome guest, than to be an invited but an unwelcome one"

"ایک غیر مدعو مگر پسند خاطر مہمان ہونا، ایک مدعو مگر بار خاطر مہمان ہونے سے بدرجہا بہتر ہے"۔

نظر غور سے دیکھا جائے تو "مدعو" اور "بار خاطر" متضاد صورتیں ہیں اور انسان یہ خیال کر سکتا ہے کہ بار خاطر لوگوں کو مدعو ہی کیوں کیا جائے؟ مگر دنیا میں دنیا دار لوگ بہت ہیں اور ہزارہا مواقع پر انسان اپنی دلی مرضی کے خلاف دعوتیں دیتا اور دعوتیں قبول

کرتا ہے۔ لہٰذا عمرانئین کی یہ رائے بالکل صحیح ہے کہ میل ملاپ میں اسبابت کا سب سے زیادہ خیال کرنا چاہئے کہ ہم دوسروں پر بار ہوتے ہیں یا نہیں؟

---

(۳۶)

सीख वाही को दीज्ये जा को सीख सोहाय,
सीख न दीज्ये बान्दरा घर बये का जाय॥

सीख (سیکھ) = نصیحت सोहाय (سوہاے) = پسند آئے

سیکھ واہی کو دیجئے جاکوں سیکھ سوہائے
سیکھ نہ دیجئے باندرا گھر بیئے کا جائے

"نصیحت اسی کو کرنی چاہئے جو نصیحت پسند کرسکے بندر کو نصیحت نہ دیجئے (اسی سے) بئے کا گھر برباد ہوا۔"

دوسرے پد میں اشارہ ہے اس قصہ کی طرف کہ جاڑے کی

ایک رات میں جب کہ بارش ہو رہی تھی ایک بیا اپنے گھونسلے میں آرام سے تھا۔ اسی درخت پر ایک بندر بھی تھا جو پانی میں بھیگ رہا تھا۔ بیے نے اُسے نصیحت کی کہ "اے بندر تو نے بھی اپنے لئے ایک گھر کیوں نہ بنا لیا جو آج بارش میں آرام سے رہتا اور یوں مصیبت نہ اُٹھاتا" یہ سننا ہی تھا کہ بندر نے جل کر بئے کے گھونسلے کو نوچ کھسوٹ کر پھینک ڈالا!

سیکھ نہ دیجئے بانْدرا، گھر بئے کا جائے!

فلسفیانہ مسائل

होत भले के सुत बुरो   भलो बुरे के होय ।
दीपक से काजल प्रगट   कंवल कीच तें होय ॥

प्रगट (پرگھٹ) = پیدا ہونا۔

ہوت بھلے کے ست برو، بھلو برے کے ہوئے
دیپک سے کاجل پرگھٹ کنول کیچ تے ہوئے

"بھلوں کی اولاد بری ہوتی ہے اور بروں کو بھلی اولاد ملتی ہے۔ چراغ سے کالک پیدا ہوتی ہے اور کنول (کا پھول) کیچڑ سے اگتا ہے"۔

علم بہبودی وبہتری نسل (نسلیات = Eugenics) باوجود ہزار کوششوں اور سالہا سال کی کاوش وجانسوزی کے یہ دریافت نہ کر سکا کہ انسانی نسل جسمانی، حیاتیاتی، اخلاقی و عرانی نقطۂ نظر سے کس طرح بہتر بنائی جا سکتی ہے۔ یہ بات

عجیب و غریب ہے کہ کم سن یا کمزور والدین کی اولاد بھی مضبوط، طاقتور، ذہین اور محنتی نکلتی ہے۔ اور با صحت، تندرست انسانوں کی اولاد نحیف و لاغر، کم ہمت اور جاہل نکلتی ہے۔ جاہلوں کی اولاد میں بڑے بڑے ذہین آدمی پائے جاتے ہیں، تو ہزارہا ذہین آدمیوں کی اولاد نکمی، ناکارہ اور پھوہڑ نکلتی ہے۔

ہندوستان میں بابر اور اس کی پانچ پشتوں نے اور میر حسن اور اُن کی چار پشتوں (حسن، خلیق، انیس، نفیس) نے دنیا میں یہ نظیر پیش کی ہے کہ اچھوں کی اولاد اچھی ہوتی ہے تو دوسری طرف ایسی ہزارہا مثالیں موجود ہیں کہ نکموں کی اولاد نکمی ہی رہتی ہے۔ ایک طرف، بھلوں کی اولاد بد نکلتی ہے تو بدوں کی، نیک اولاد ہوتی ہے۔ غرض کہ نسلیات کا علم بالکل ابتدائی حالت میں ہے اور اس کے قوانین و اصول مرتب کرنے میں اطمینان بخش کامیابی انسان کو ہنوز حاصل نہیں ہوئی۔

بہر حال دو ہے میں تشبیہ بڑی لاجواب ہے اور کم از کم اردو داں حضرات کے لئے بالکل نئی ہے۔ جاپانی زبان میں ایک ضرب المثل ہے

کہ کنول کی بھی جڑ کیچ میں ہوتی ہے

(۳۸)

संगत ही गुन ऊपजे   संगत ही गुन जाय।
बांस फांस उर मीस्री   एकै भाय बिकाय॥

سنگت ہی گُن اُوپجے سنگت ہی گُن جائے
بانس پھانس اور میصری ایکئے بھاؤ بکائے

"صحبت ہی سے بشر کی قدر پہچانی جاتی ہے، اور صحبت ہی کا لحاظ کیا جاتا ہے چنانچہ بانس، پھانس اور مصری (سب ہی) ایک بھاؤ پر فروخت ہوتے ہیں"

بالکل صحیح بات بیان کی گئی ہے۔ دنیا میں انصاف مطلق معمول میں شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کبھی ماحول کی وجہ سے انسان اور اشیاء کی عزت بڑھ جاتی ہے۔ اور کبھی خوامخواہ عزت میں تنزل آجاتا ہے۔ لوگ بلا سبب بڑے آدمی تصور کئے جانے لگتے ہیں۔ انھیں خوامخواہ اہمیت

حاصل ہو جاتی ہے اور کبھی بلا وجہ ان کی وقعت گھٹ جاتی ہے۔ اور انھیں کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ اور، تو اور، کسی شہر میں، جب انسان سینما ہی خانے کے قریب ایک شریف آدمی کو کسی ملاقاتی سے، سرِراہ باتیں کرتے دیکھتا ہے، تو اس کے متعلق ایک خاص رائے قائم کرتا ہے اور اُسی شخص کو پھر کسی علمی تقریر کے موقع پر مقرر کے بالکل قریب پاتا ہے تو اس کی موجودہ رائے پہلی رائے سے بالکل جدا ہوتی ہے۔

بہر طور ماحول سے انسان کی قدر بہت کچھ بڑھتی اور گھٹتی رہتی ہے اسی لئے شکسپیر نے خوب کہا ہے کہ "بعض پیدائشی طور پر بڑے ہوتے ہیں بعض بلندی حاصل کرتے ہیں، اور بعض خواہ مخواہ بلند مرتبہ بنا دیے جاتے ہیں"۔ اکبر مرحوم نے بھی اسی طرح کا ایک بے مثل شعر کہا ہے ؎

بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں
گو گردِ راہ ہیں، مگر آندھی کے ساتھ ہیں

(۳۹)

اس حقیقت کو کہ نا اہل، و نا فہم انسانوں کو تعلیم و تربیت سے نہ تو فائدہ پہونچتا ہے اور نہ پہونچ سکتا ہے، مشرقی شعراء نے بھی خوب

پہچانا ہے۔

यद्यपि सुधा बरसहिं जलद	फूलहिं फरहिं न बेत
जो गुरु मिलहिं बिरंचि शिव	मूरख हृदय न चेत

यद्यपि (یدیپ) = اگر — सुधा (سودھا) آبحیات

जलद (جلدھ) = بادل — मूरख (مورکھ) = بیوقوف۔

बिरंचि शिव (برنچ شید) = خدا (علم کا دیوتا)

یدیپ سُدھا برسہیں جلدھ — پھلہیں پھریں نہ بیت،

جو گُرو ملہیں برنچ شیو — مُورکھ ہردے نہ چیت،

"اگر ہمیشہ آب بہشت کی بارش ہوتی رہے (تب بھی) بید پھولیگا پھلیگا نہیں، اسیطرح بیوقوف (سادہ لوح) کبھی ہوشیار نہ ہوسکیگا حتیٰ کہ علم کا دیوتا ہی اُس کا استاد کیوں نہ مقرر ہو"

(۴۰)

اسیطرح ... ہے کہ بد طینت لوگوں کی خصلت کو ل...

سکیں اور انھیں نیک دل بنا سکیں۔ اچھی صحبت سے وہی متاثر ہو سکتے ہیں جن میں اچھے بننے کی صلاحیت موجود ہو۔ اچھائی کی قابلیت نفس بشری میں ہونی چاہئے تب ہی وہ عمدہ خصائل اختیار کر سکیگا ورنہ نہیں۔

तुलसी जो तुम कहत ते   संगत ही गुन होय ।
मांझ उरवारी रमसरा   रस काहे नहिं होय ॥

मांझ (مانجھ) = درمیان   उरवारी (اوکھا - ی) = گنا

रमसरा (رمسرا) = بغیر رس کا درخت

تُلسی جو تم کہت تے، سنگت ہی گُن ہوئے
مانجھ اوکھاری رمسرا، رس کاہے نہیں ہوئے

"اے تلسی جو تم کہتے تھے کہ صحبت سے اوصاف پیدا ہوتے ہیں (تو یہہ بھی بتاؤ کہ) گنّوں (کے کھیت) میں (اُگنے والے) نرکل میں رس کیوں نہیں ہوتا"

یہ ہی نہیں کہ اچھوں کی صحبت سے بُرے اچھے نہیں ہو جاتے بلکہ وہ لوگ جو حقیقی طور پر بامروت، پاک طینت، خوش مزاج، صاف گو، راست باز ہوتے ہیں انھیں کیسی ہی بُری صحبت ہو بُرا نہیں بنا سکتی اس حقیقت سے بھی ہندی شعرا اچھی طرح خبردار تھے، چنانچہ ایک نادر مثال دیکر گوسائیں تلسی داس نے یوں اس کو واضح کیا ہے۔

तुलसी सांचे सुजन को का करसके कुसंग ।
मलिया बिष लागे नहीं लिप्टे रहत भुजंग ॥

सुजन (سُجن) = شریف　कुसंग (کُسنگ) = بُری صحبت
बिष (بِش) = زہر　भुजंग (بھوجنگ) = سانپ

تُلسی سانچے سُجن کو، کا کر سکے کُسنگ
ملیا بِش لاگے نہیں، لپٹے رہت بھوجنگ

اے تُلسی ایک سچے شریف کو کسی بدخو کی صحبت کیوں کر بگاڑ سکتی ہے

صندل کے درخت سے اژدہا لپٹا رہتا ہے لیکن پھر بھی اس کا زہر صندل میں نہیں سرایت کرتا۔"

(۴۲)

समयसमयसुन्दरसबै रुप कुरुप न कोय ।
मन कीरुचीजितनाजितै तित तितीरुचिहोय ॥

समय (سمئے) وقت सुन्दर (سندر) خوبصورت
रुप (روپ) شکل

سمئے سمئے سندر سبھئے' روپ کروپ نہ کوئے
مَن کی رُوچی جِتّی جِتے تِت تِتّی رُوچی ہوئے

"اپنے اپنے وقت پر ہر ایک چیز پیاری معلوم ہوتی ہے۔ (بھلی لگتی ہے) خوبصورتی یا بدصورتی حقیقتاً کوئی چیز نہیں۔ دلکو جو کوئی جسقدر بھا جاے وہ اسی قدر پیارا معلوم ہوتا ہے"۔

بالکل صحیح ہے، کہ حسن و قبح، شیرینی اور روکھا پن، شائستگی

اور ناشائستگی، سب اضافی اصطلاحیں ہیں جن کے متعلق کبھی قطعی طور یہ فیصلہ نہیں ہو سکتا کہ یہ درحقیقت ہیں کیا۔ مثل اخلاقیات کے جمالیات کی جملہ اصطلاحیں سراسر اضافیت پر مبنی ہیں قطعیت کا جمالیات میں نام تک نہیں!

کونسی چیز اچھی اور کون سی بُری ہے؟ بھلائی کسے کہتے ہیں؟ خوبصورتی یا بدصورتی کا معیار کیا ہو سکتا ہے؟ یہ اور اسی قسم کے سینکڑوں سوالات کا تشفی بخش جواب کسی سے نہیں دیا جا سکا۔ اچھی اور بُری چیزوں کا تعلق مذاق سے بہت قریبی ہے۔ مذاق پابند ہے دل کا اور دل ہے کہ قوانین و اصول کا تابع نہیں۔

(۴۳)

حقیقی معنی میں جتنے بڑے آدمی گذرے ہیں انہوں نے ہمیشہ دوسروں کے اوصافِ حمیدہ، اخلاقِ جمیلہ اور عاداتِ عالیہ کی عزت کی اور ہمیشہ اس کا اعتراف کیا اور مغلوب دشمن کی بشرطیکہ وہ دلاور بہادر ہو فاتح نے ہمیشہ قدر و منزلت کی ہے۔ سکندرِ اعظم نے مشرق میں اکبرِ اعظم نے ہندوستان میں، فریدرش نے پرشیا میں نپولین نے یورپ

ہیں اور بسمارک نے جرمانیہ میں مغلوب مگر بہادر دشمنوں کیساتھ سلوک کرنے کے لئے نظیریں قائم کردی ہیں۔ اسی طرح بڑوں کی عزت بڑے ہی کرسکتے ہیں اور شریف زادیوں کی قدرومنزلت باعصمت عورتیں ہی پہچان سکتی ہیں۔

वीर सराहैं बीरता जती जेषता जान ।
रहमन सांचे सूर को बैरी करत बरवान ॥

वीर बीरता (بیر۔ بیرتا)۔ بہادر بہادری

जती जेषता (جتی جیتا) = باعصمت عصمت

सुर (سور)۔ بہادر　　बैरी (بیری)۔ دشمن

بیر سراہیں بیرتا ، جتی جیتا جان
رحمٰن سانچے سورکو ، بیری کرت بکھان

"بہادر بہادروں کی تعریف کرتا ہے۔ اور باعصمت ہی عصمت کو پہچانتی ہے۔ اے رحمٰن سچے بہادر کی دشمن بھی تعریف کرتا ہے"

कबीर बैरी सबल है एक जीव रिपु पांच।
अपने अपने सवाद को सभी नचावें नांच॥

बैरी (بیری) = دشمن　　सबल (سبل) = طاقتور

जीव (جیو) = جان　　रिपु (رپو) = مدمقابل

सवाद (سواد) = لذت

کبیر بیری سبل ہیں ایک جیو رپو پانچ
اپنے اپنے سواد کو، سبھی نچاویں ناچ

"اے کبیر دشمن بہت طاقتور ہیں ایک جان ہے اور مدمقابل پانچ ہیں اور ہر ایک اپنے مزے کے لئے ہمیں ناچ نچا رہا ہے"

کبیر داس نے یہ غضب کا دوہا کہا ہے جسکی تعریف وہی کرسکتے ہیں جو فلسفیانہ مذاق رکھتے اور فلسفہ کی ابتدائی کلیات کے علاوہ "اسرار خودی" سے بھی واقف ہوں کانٹ جرمانیہ کا قابل ترین فلسفی جسکی بابت

کہا گیا ہے کہ دنیائے مغرب میں اس کی ٹکر کا صرف ایک اور فلسفی (سقراط) گزرا ہے) کہتا ہے:۔

"دو چیزیں ہمیشہ دل کو نئی نئی تخیلات اور پُر کیف تصورات سے معمور کرتی ہیں۔ ایک تو تاروں بھرا آسمان جو میرے اوپر ہے اور دوسرے وہ اخلاقی قانون جو میرے اندر ہے"

"میں اپنے اندر یہ خوبیاں اور یہ کمزوریاں پاتا ہوں"۔ "مجھ میں کتنی ہی برائیاں موجود سہی ریاکاری کا عیب تو میں اپنے اندر نہیں پاتا" یہہ اور اسی قسم کے الفاظ جو ہمارے روز مرہ میں بھی اکثر بولے جاتے ہیں۔ ایک فلسفیانہ معمہ ہیں جنکی تحلیل آسان نہیں "مجھ میں" کیا معنے؟ "میں" کیا چیز ہے؟

بالعموم انسان کے اندر دو قوتیں تسلیم کیجاتی ہیں۔ ایک عقل (جس میں ضمیر بھی داخل ہے) دوسرے نفس (جس میں دل بھی شامل ہے) نفس اور عقل انسان کے جسم پر حکمرانی کرتے ہیں اور گو نفس کا زور بہت چلتا ہے مگر عقل یا ضمیر بھی کسی طرح بے بس اور لاچار نہیں۔ چنانچہ ہر مذہب نے انسان کو اس کے نیک و بد افعال کا ذمہ دار ٹھیرا کر اسے جزا و

سزا کی امید و بیم دلائی انسان عقل اور نفس دونوں کو اپنا سمجھتا ہے اور یہ دونوں ملکر جسم و روح کے اتحاد سے انسان کی شکل اختیار کرتے ہیں۔

اس دوہے میں شاعر نے عجیب بات یہ پیدا کی ہے کہ نہ صرف اپنے جسم کو بلکہ اپنے نفس کو بھی اپنے سے جدا ٹھیرایا جب جسم و نفس اپنے نہوں تو ظاہر ہے کہ انسان کی شخصیت و انفرادیت کس درجہ باقی رہجاتی ہے! نہ جسم اپنا، نہ نفس اپنا عقل کا زور ہی کتنا؟ روح تو ایک نامعلوم شئے ہے ہی۔ پھر "ہم" "کیا ہیں" اور "ہم ہیں" میں "کسقدر ہوں"؟

اس فلسفیانہ بحث سے قطع نظر دوہے کے مطلب پر غور کیجئے اور شاعر کے ذہن کی داد دیجئے کہ کیا بات پیدا کی ہے۔

دنیا میں جس قدر افعال ہوتے ہیں وہ سب ایک نظریہ کے تحت لائے جاسکتے ہیں جس کو نظریہ لذتیت کہتے ہیں یعنی یہ کہ ہر شخص کا ہر فعل جلب منفعت یا دفع مضرت کے لئے ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو سڑکوں پر جسمانی محنت کرتے ہیں مدرسوں میں تعلیم دیتے ہیں نمود کے لئے دولت لٹاتے ہیں۔ قوم کے لئے مصیبتیں برداشت کرتے ہیں، اپاہج خانہ، غریب خانہ معذور خانہ قائم کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو سینما جاتے ہیں تھیٹر

دیکھتے ہیں میلوں اور نمایشوں کی سیر کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ ہر عالم، ماہر فن
زباندان، پیشہ ور، مزدور، حاکم یا منتظم حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو تارک الدنیا
ہیں، بن باسی ہیں، زہد و تقویٰ کے اثر سے اور تعلیم الٰہی کے مطابق،
نفس کشی کو اپنا شعار سمجھے ہوئے ہیں۔ لذت کے خواہاں ہیں۔ لذت
ظاہر ہے کہ تین قسم کی ہو سکتی ہے۔ روحانی عقلی اور جسمانی! اول تو روحانی
اور عقلی لذت کی دنیا بحیثیت مجموعی زیادہ طلبگار نہیں۔ انسان زیادہ تر جسمانی
لذتوں کے لئے مرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ روح اور عقل میں تفریق اور حد
بندی آسان نہیں بلکہ سخت مشکل قریب قریب محال ہے سچ پوچھئے تو انسان
جسمانی لذتوں کا آرزومند ہے۔ اور جسمانی تکالیف سے حذر کرتا ہے
انسان میں بلکہ تمام جانداروں میں سب سے زیادہ قوی جبلت جو پائی
جاتی ہے وہ خواہش پایندگی ہے اور یہ بھی جسمانی ہے! ان جسمانی لذتوں
کو حاصل کرنے کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کرتا؟

بذوق طالب علم رٹ رٹ کر محنت کرتے ہیں۔ ڈگری کی خاطر!
جہاں ڈگری مل گئی کہ ایک محکمہ سے دوسرے محکمہ میں، ایک جگہ سے
دوسری جگہ نوکری کی تلاش میں جا نکلے، خطوط پہونچائے، چٹھیاں لکھیں یا

خوشامد کی زور ڈلوائے، تب کہیں آرزو پوری ہوئی۔ اور مدّت العمر جسمانی
راحت پہنچانے والی نوکری مل گئی یہی حال تقریباً تمام پیشہ وروں اور
آجروں کا ہے۔

لیکن سچ پوچھئے تو دنیا میں یہ کھلبلی پیٹ کے دھندے کی وجہ
سے اس قدر نہیں ہے، جس قدر کہ عیش و راحت یعنی لذات نفسانی
حاصل کرنیکی بدولت نمودار ہے۔ انسان کو اگر صرف پیٹ بھرنا
مقصود ہوتا تو اسکا کام عشر عشیر بھی مشکل نہ ہوتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جیسے
جیسے اس کا پیٹ بھرتا جاتا ہے اس کے حواس خمسہ بیدار ہونے لگتے
ہیں جس رفتار سے اس کی زیست کا سامان مہیا ہوتا جاتا ہے اس سے
تیز تر رفتار سے خواہشات نفسانی پیدا ہوتی جاتی ہیں چھونے، چکھنے
دیکھنے سننے، سونگھنے کی آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں اور ان آرزوؤں کو تشفی
اور دل کے ارمانوں کو تسلی دینے کے لئے انسان ہر طرح سے کوشاں
رہتا ہے اسی لذت کا طفیل ہے کہ دنیا میں اس قدر چہل پہل، رونق و
گرم بازاری نظر آتی ہے۔

خواہش وید علاء الدین سے پوچھئے کہ پدماوتی کی ایک جھلک کے لئے اس نے خود کو برباد کیا، پھر بھی اس کی مراد پوری نہ ہوئی؛ قوت لامسہ دنیا میں انسانوں سے کیا کیا افعال سرزد کراتی ہے اور گلی کوچوں میں وقت بے وقت، دن دوپہر، شام رات گھمایا کرتی ہے اور انسان مجبور، کمزور انسان اس کے چکر میں اسوقت تک پڑا رہتا ہے جب تک کہ خود طاقت مفقود نہ ہو جائے۔

حواس خمسہ ایسی زبردست قوتیں ہیں جن کے سامنے خودداری، ضبطِ نفس، احساسِ شرافت، راست بازی کی "طاقتیں" طفلانہ ہاتھا پائی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتیں اسی لئے کبیرداس نے سچ کہا ہے کہ اے کبیر دشمن بہت طاقتور ہیں ایک جان ہے تو اس کے مقابل پانچ ہیں، اور ہر ایک اپنے اپنے مزے کی خاطر (ہمیں) ناچ نچاتا ہے!

تحصیل لذت کے لئے جو جانکاہی اور کوہ کنی کرنی پڑتی ہے اور ہر کامیابی کے لئے جس قدر سراسیمہ جدوجہد درکار رہے۔ اس کے لئے یہ کہنا کہ "وہ اپنے اپنے سواد کو سب ہی نچاویں ناچ" انتہا درجہ کی سادگی ہے۔

"ناچ نچانا" ایک مبتذل محاورہ ہے۔ مگر جس شان سے آن بان لئے اس

موقع پر اس کو استعمال کیا گیا ہے اُس سے کبیرداس کی قادرالکلامی ظاہر ہوتی ہے۔

انسان کی قوتِ نفس اور مجبوریٔ عقل کو جس عمدگی سے اِس دوہے میں ادا کیا گیا ہے اُس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ انسان بالکل کٹھ پتلی کے مانند نظر آتا ہے جسے پانچوں انگلیاں نچا رہی ہیں۔

۴۵

चंमपा तो में तीन गुन रंग रूप और बास ।
अवगुन तो में कौन है भंवर न बैठे पास ॥

چمپا توہ میں تین گُن رنگ روپ اور باس
اوگن توہ میں کون ہے بھنور نہ بیٹھے پاس

بیقدری عالم کے ہاتھوں دنیا کے بہترین اور قابل ترین افراد کا خون ہوا اور شاذونادر ہی انہیں ایامِ زیست ہی میں وہ رتبہ ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ جس طرح سقراط کے زمانہ کے حکام نے سقراط کا خون کیا تھا

اسی طرح دنیا کے طول و عرض پر آج بھی بڑے بڑے اشخاص پر تباہی
و بربادی چھائی ہوئی ہے دنیا میں اکثر دیکھا گیا کہ بھلے آدمی کو کوئی
نہیں پوچھتا عقلمند اور دیانتدار آدمیوں کا کوئی پرسان حال نہیں،
حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جن میں ذاتی شرافت، خاندانی عزت، عقل و ہنر، صورت
شکل سب کچھ موجود ہو دنیا اور اہل دنیا کی لاپرواہی کی وجہ سے کسمپرسی
کے عالم میں پڑے ہوئے ہیں۔ شاعرانہ انداز میں اسی مطلب کو شاعر سودا
کے پیرایہ میں یوں ادا کرتا ہے:- "اُے چمپا تجھ میں تینوں اوصاف موجود
ہیں رنگ بھی ہے اور خوشبو بھی پھر بھی کیا سبب ہے کہ بھونرا پاس تک
نہیں پھٹکتا؟"

(۴۶)

اسی قسم کا ایک اور لاجواب دوہا ہے جو متذکرہ بالا دوہے
سے بھی بہتر ہے کیونکہ اس میں گرفت کا کوئی موقع نہیں، حالاں کہ قبل کے
دوہے میں ایک خامی یہ ہے کہ چمپا میں تین اوصاف تو ہیں جن کا ذکر
کیا گیا ہے۔ مگر جس پھول میں رس نہ ہو وہ کس کام کا؟ اب حسب ذیل
دوہے کو لفظی اور معنوی خوبیوں کے اعتبار سے دیکھئے [illegible]

مکمل ہے۔

चन्दन परो चमार कैं   नित उठ चीरत चाम।
कहु चन्दन कैसी भई   परो नीच से काम॥

چَندَن پرو چمار کیں، نِت اُٹھ چیرت چام
کہو چندن کیسی بھئی ؟ پرو نیچ سے کام؟

وہ صندل جو حسینانِ جہان کی پیشانیوں پر ملا جاتا ہے، وہ صندل جس کی قدر مندروں میں ہوتی ہے، وہ صندل جو ہر پوجا پاٹ کے موقع پر استعمال میں آتا ہے، وہ صندل جو شادی کے وقت دولہا دولہن کے ماتھے پر لگایا جاتا ہے، اور جس کا تیل اور عطر چمبیلی کے تیل اور گلاب کے عطر سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے، اُسی صندل کا ایک تختہ چمار کے گھر میں پڑا ہے جس پر وہ چمڑا تراشا کرتا ہے۔ شاعر صندل سے مخاطب ہو کر کہتا ہے "اے صندل بتا اب کہ ذلیل

پالا پڑا ہے کیسی گذر رہی ہے؟" جس قدر مثال نادر ہے اسیقدر لطیف بھی ہے جس قدر خیال پاکیزہ ہے اسی قدر طرزِ ادا دلفریب بھی ہے

(۴۷)

तुलसी आह गरीब की　　कबहुं न खाली जाय,
मरे चाम की सांस से　　सार भसम होजाय ॥

تلسی آہ گریب کی کبھو نہ کھالی جائے
مرے چام کی سانس سے سار بھسم ہوجائے

"غریبوں کی آہ نہ لو" یہ نصیحت صدیوں سے پشت در پشت چلی آئی ہے اور ہر قوم کی ذہنیت میں یہ قول مستحکم طور پر جا گزیں ہے کہ ظالم ظلم کا برا کا دنیا ہی میں برا حشر نکلتا ہے آخرت میں جو سزا بھگتنی پڑے گی وہ الگ ہے۔ اولوالعزم شاہان ذی مرتبت مثلاً نیرو، نادرشاہ اور مغرور و تشدد پسند حاکمین مثلاً قیصر ولیم اور بچہ سقہ کے نتیجہ کو دیکھا ہے نقش پتھر کی لکیر کے مانند ہوگیا ہے۔ عام مشاہدہ بھی یہی ہے کہ ظالم جابر تشدد پسند

دنیا میں سرخرو نہیں رہ سکتے اور اکثر ان کا نتیجہ خود ان کے لئے خراب نکلتا ہے۔ اسی مفہوم کو تلسی داس نے ایک نہایت اچھوتے طریق پر بیان کیا ہے "اے تلسی غریب کی آہ کبھی بے تاثیر نہیں رہتی۔ مردہ چمڑے کی بنی ہوئی دھوکنی سے لوہا بھی پگھل جاتا ہے"؟

بلند خیالی اور ندرت تشبیہ تو قابل تعریف ہیں ہی مگر اس دوہے کی تمام جان لفظ "بھسم" میں پھڑکتی ہے۔ اس دوہے کا حقیقی لطف اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کوئی اہل زبان۔ ہندی صوتیات کا ماہر پنڈت اپنے دل نشین لہجہ میں پڑھ کر سنائے۔ یہ اس پایہ کا دوہا ہے کہ اس کے متعلق دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ کوئی صاحب علم و فہم اس کو ناپسند نہیں کر سکتا۔

(۴۸)

دور روزہ زندگی کا دکھڑا مشرقی شعراء نے بہت رویا ہے۔ دنیا ہیچ ہے۔ عالم ایک سرائے ہے۔ دو دن کی زندگی کا کیا بھروسہ انہیں خیالات نے ہماری قوم کو ڈبو دیا جب تک ہندوستانیوں میں خواہش زیست (Der Wille zum Leben) اور زیادہ پیدا

ہوگی۔ الم پرستی کی جگہ چین پرستی نہ لے سکے گی قنوطیت کی بجائے رجائیت
نہ قائم ہو جائے گی۔ اس وقت تک معاشرت کی ترقی کی امید موہوم
اور مرفہ الحالی کی توقع محال ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جدید ترکی کے
زبردست فرمانروا نے مدارس کے درسی کتب میں قدیم شعراء کے کلام کا
انتخاب بھی قانوناً ممنوع قرار دیا ہے۔ اس میں ایک بڑی مصلحت پنہاں
ہے ہمیں بھی چاہیے کہ اس قسم کے ادب کی حتی المقدر مخالفت کریں مثالاً
اس دوہے کو لیجیے۔

माटी कहै कुमहार सें　　तू क्या रौंदै मोय ।
इक दिन औसा आइगा　　मैं रौंदूगी तोय ॥

ماٹی کہے کمھار سے تو کیا روندے موئے
اک دن ایسا آئے گا میں روندوں گی توئے

" مٹی کمہار سے کہتی ہے تو کیوں مجھے روندتا ہے؟ ایک دن ایسا
آئے گا کہ میں تجھے روندوں گی۔

اس دوہے میں اگر کوئی خوبی ہے تو صرف یہی ہے کہ الفاظ میں شیرینی و دل نشینی بہت ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ عوام میں یہ دوہا بہت مقبول ہوا ورنہ اس میں نہ کوئی خیال ہے نہ فلسفہ جو بات کہی ہے وہ غلط جو تشبیہ دی ہے وہ غیر موزوں۔

جس آہستگی اور نزاکت سے کمہار مٹی کو حرکت دیتا ہے اس سے کمال شفقت اور انتہائی احتیاط ظاہر ہوتی ہے نہ کہ روندے جانے کا گمان پیدا ہوتا ہے مٹی کی تیاری میں بیشک مٹی کو ملائم کرنے کے لئے جو کچھ سختی برتی جاتی ہے وہ بھی ناقابل لحاظ ہے کیونکہ کسی چیز کو بہتر بنانے کے خاطر اسپر سختی کرنا اور بات ہے اور کسی پر فی نفسہ ظلم و تشدد برتنا جدا گانہ شے ہے۔ بہر طور وہ کمہار جو مٹی کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتا ہے اور عمدہ خوبصورت کارآمد اشیاء طیار کرتا ہے اسی مٹی کو جو تالاب یا دریا کے کنارے کس مپرسی میں پڑی رہتی ہے ۔لاکر اس قابل بناتا ہے کہ وہ مفید اشیاء کی شکل اختیار کرے اس کے ٹوٹنے کا لوگوں کو خوف ہوا اور سب سے بڑھکر لوگوں کے سر پر اور حسینوں کی کمر پہ لچکے ۔ اس الزام کا مستحق کبھی نہیں ہو سکتا کہ اس نے مٹی کو روندا۔ اس دوہے کا کوئی لطیف مفہوم ہو ہی نہیں سکتا بجز اس کے

کہ اس میں ایک فرسودہ نصیحت اور ایک پامال تصور مضمر ہے۔ اس کے الفاظ میں شیرینی بہت ہے ساتھ ہی اس کے دوسرے حصّہ میں بے ثباتیِ عالم کا ذکر ہے۔ ہندوستانیوں کے سدا مغموم دلوں کو بے ثباتیِ عالم کا کوئی سا شعر یا مضمون سنا دیجئے اور وہ انھیں ضرور بھائے گا یہ ہماری کمزوری ہے کہ اس دوہے کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی۔

اس دوہے کی تائید میں یہ کہا گیا ہے کہ اس کا "اصلی" مقصد یہ ہے کہ انسان غریبوں پر ظلم نہ کرے اور اپنے قلب کی سختی کے باعث ان مظلوموں کو اس طرح اپنے پیروں تلے نہ روند ڈالے جیسے مٹی کو کمھار روندتا ہے۔

اس کے جواب میں میں پھر بھی کہونگا۔ کہ "روندتا" کے معنی میں ہمیشہ غیر منصفانہ ظلم و تشدد و سختی و بے رحمی مضمر ہیں۔ فرعون مصریوں کو روندا کرتا تھا۔ اہل چین غیر ممالک کے باشندوں کے ہاتھوں روندے جا رہے ہیں یہ کہنا صحیح ہے۔ مگر والدین کی سزا، یا تمدنی ممالک کے قیود کو روندے جانے سے تعبیر کرنا بیجا ہوگا حقیقتاً بھی کوئی "روندنے" کا لفظ اس وقت استعمال نہیں کرتا جبکہ سختی سے خود اس کو فائدہ پہنچ رہا ہو جس پر سختی

کیجائے۔ اب اس مفہوم کو دوہے پر منطبق کرکے دیکھئے ہمیں اقرار کرنا پڑے گا کہ مٹی کی قدر و قیمت میں کئی گنا اضافہ محض کمھار کی کوششوں کی بدولت ہوتا ہے اس پر بھی مٹی سے یہ کہلوانا کہ "اے کمھار تو مجھے نہ روند" یعنی مجھ پر ظلم و تشدد نہ کر۔ مٹی کی احسان فراموشی یا کم از کم نادانی ظاہر کرنا ہے کیونکہ جس شخص کی بدولت مٹی کے مرتبہ میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ دوسروں کے کام آسکتی ہے اسی کی وہ شکایت کرتی ہے۔

بالفرض شاعر کی غرض اس دوہے سے یہ تھی کہ ظالموں کو ظلم و تشدد سے باز رہنے کی ہدایت کیجائے یا امیروں کو غریبوں کی حقارت سے منع کیا جائے تو ہمیں کہنا پڑیگا کہ شاعر کو اپنے مقصد کے حاصل کرنے میں مطلق کامیابی نہیں ہوئی۔

ظلم و تشدد سے باز رہنے کی ہدایت کا یہ طریق نہیں بلکہ شاعرانہ انداز میں نصیحت یوں کیجاتی ہے

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
یکسر وہ استخوانِ شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر

ہیں یہ کبھی کسی سر پر غرور تھا !

(میر)

ہندی میں بھی یہ ہدایت کئی بار عمدہ پیرایہ میں کیگئی ہے چنانچہ
اس سے قبل ہی ہماری نظر سے یہ دوہا گذر چکا ہے۔

تلسی آہ گریب کی کبھو نہ کھالی جائے
مرے چام کی سانس سے سار بھسم ہو جائے

اب ایک اور دوہا سنیئے اور شاعر کی ندرت تشبیہ کی داد دیجیے
اور حقیقت حالت کا بھی لحاظ کیجیئے۔

तिनका कबहुं न निंदिये जो पाथन तर होय ।
कबहूं उड़ि आंखिन परै पीर घनेरी होय ॥

निंदिये (نیندئیے) حقیر سمجھئے   पीर (پیر) تکلیف
घनेरी (گھنیری) بہت۔

تنکا کبھوں نہ نندئے جو پائیں تر ہوئے
کبھوں اُڑے آنکھین پرے پیر گھنیری ہوئے

"(اُس) تنکے (کو بھی) جو پاؤں کے نیچے ہو، حقیر نہ سمجھئے، کبھی اُڑ کر جب وہ آنکھ میں پڑ جاتا ہے تو سخت تکلیف ہوتی ہے۔"

بیمثل تشبیہ ہے۔ اب اس دوہے کو ذرا کمھار والے دوہے سے مقابلہ کر کے دیکھئے کہ دونوں میں کس قدر فرق ہے۔ یہ معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ یہ دوہا اور کمھار والا دوہا دونوں کبیر داس نے کہے ہیں مگر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ایک ہی مقصد کے حاصل کرنے میں ایک ہی شخص کو کبھی ناکامی ہوتی ہے اور کبھی کامیابی۔

(۵۰)

नेह सगा सोई सगा हाड़ सगा नहिं होय।
मां बैठी तृया जरै अचरज जग को होय

نیہ (नेह) = محبت سوئی (सोई) = وہی

हाड (ہاڑ) ہڈی अचरज (اچرج) تعجب۔

نیھ سگا، سوئی سگا، ہاڑ سگا نہیں ہوئے
ماں بیٹھی، تریا جرے اچرج جگ کو ہوئے

"جس سے محبت ہو وہی سگا ہے، ہڈی (خون) سگی نہیں ہوتی۔ ماں بیٹھی رہی اور بیوی جلا کی، ہر ایک اس تعجب کی بات کو دیکھے"

مشرقی ممالک میں خصوصاً اور یوروپی و امریکی تہذیب کے ان خاندانوں میں جہاں وجدانیت (Sentimentalism) کا اب بھی تسلط ہے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ لوگوں میں محبت خونی رشتہ کی بدولت ہوتی ہے "خون کا جوش ہے" "آخر اپنا خون ہی تو ہے" "قوم کے افراد کو چاہیے کہ ایک دوسرے کو بھائی بھائی کی طرح چاہیں" یہ اور اسی قسم کے جملے جو ہماری زندگی میں عام طور پر روزانہ بے تکلف بولے اور بے چون و چرا تسلیم کر لیے جاتے ہیں اس کی دلیل ہے کہ محبت اور خونی تعلق عرف خاص و عام کے اعتبار سے لازم و ملزوم تصور کیے جاتے ہیں یعنے جنمیں خونی تعلق ہوگا اسمیں محبت بھی ہو گی حالانکہ واقعہ نہیں کہ لوگوں میں محبت آپسی خونی تعلقات کی وجہ سے ہوتی ہے خون اور محبت میں کوئی

معینہ ومقررہ نسبت نہیں اور نہ وہ لازم و ملزوم ہیں یعنی یہ کہ جس قدر دور کا رشتہ ہوگا۔ اسیقدر کم محبت ہوگی اور انسان سب سے زیادہ اپنی اولاد کو چاہیگا۔ اگرچہ یہہ ایک واقعہ ہے کہ اکثر انسان اپنی اولاد کو سب سے زیادہ چاہتا ہے مگر یہہ ہمیشہ ضروری نہیں۔ "اکثر" اور "ہمیشہ" میں فلسفیانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بہت بڑا فرق ہے۔ اگر کسی قانون یا کلیہ کے خلاف ایک مثال بھی پیش کیجاسکے تو وہ قانون مطلق معنی میں صحیح نہیں رہتا۔ اس میں صرف اضافی صحت باقی رہ جاتی ہے۔ اگر کسی حسابی نظریہ کے خلاف ایک مثال بھی پیش کیجاسکے تو اس کی خصوصیت قطعیت سے گھٹ کر اضافیت پر آجاتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہمیں یہی تسلیم کرنا پڑیگا کہ خونی رشتہ میں محبت کا ہونا لازمی نہیں ہے! کیونکہ یہہ بھی اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ لوگ اپنے بھانجے بھتیجوں سے زیادہ اپنے دوست اور اس کی اولاد کو چاہتے ہیں۔ نادر شاہ کو یقیناً ایک عرصہ تک ستارہ سے زیادہ محبت تھی بہ نسبت اپنی حقیقی اولاد کے۔ رامچندر جی اور بھرت اگرچہ سوتیلے بھائی تھے مگر ان میں سگے بھائیوں سے زیادہ محبت تھی اور جس وفاداری اور ایمانداری سے بھرت نے رامچندر جی سے سلوک کیا

وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ اگر راما نے والد کے حکم کے مطابق جلا وطنی قبول کی اور (۱۴) سال اپنے وطن سے جدا رہا۔ بن بن کی خاک چھانی اور مصیبتیں جھیلیں تو بھرت نے ایمان داری سے بڑے بھائی کی قائم مقامی کی اور راما کی واپسی پر اپنی سلطنت (جس کی ہوس میں کئی بادشاہوں نے سگے بھائیوں بھتیجوں اور والدین کا خون کیا اور جن کی ظالمانہ ذلیل حرکات کی تاریخ میں بلا مبالغہ ہزارہا مثالیں ملتی ہیں) سوتیلے بھائی کے سپرد کی۔ اگر خونی رشتہ سے محبت پیدا اور قائم رہتی تو قابیل پر ہابیل کا وار نہ چل سکتا۔ علاءالدین اپنے چچا کا قاتل نہ بنتا۔ اور گوتم بدھ حق کی تلاش میں بیوی بچوں کو چھوڑ کر خاموش یوں چلے نہ جاتے۔ اس عام حقیقت کو حافظ شیرازی نے اپنے بےمثل کلام میں اس طرح ظاہر کیا ہے۔

ایں چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم
ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم

ہیچ رحمی نہ برادر بہ برادر دارد
ہیچ شفقت نہ پدر را بہ پسر می بینم

دختران را ہمہ جنگ است و جدل با مادر

پسران را ہمہ بدخواہ پدر می بینم

غرضیکہ لگاؤ ہمدردی ہو تب ہی محبت پیدا ہوتی ہے اور جس سے جس قدر رابطہ ہو جائے اسی قدر محبت ہو جاتی ہے بعض والدین کو اپنی ناخلف اولاد سے نفرت ہوتی ہے اور وہ کسی دوست کی اولاد کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں پس ثابت ہوا کہ محبت اور خونی رشتہ کا ہونا کوئی قانون، کوئی کلیہ، کوئی نظریہ یا کوئی قطعی اصول نہیں۔

جس حقیقت کو اعلیٰ نفسانی تحقیقات (Higher psychological research) نے بھی اب تک بخوبی نہیں پہچانا۔ اس کا ذکر یہ ہندی شاعر یوں کرتا ہے "محبت سگّی ہوتی ہے اور سگا ہونے کی دلیل ہے۔ ہڈی یا خون کا ایک ہونا سگے پن کا ثبوت نہیں (جس سے جس قدر محبت ہو جائے وہ اسی قدر سگا ہے قطع نظر اس کے کہ اس سے قدرتی رشتہ کیا ہے) کس قدر تعجب کی بات ہے کہ ماں اپنے سگے بیٹے کی کریا کرم (cremation) کے وقت بیٹھی رہتی ہے اور بیوی جو اپنی انتہائی محبت اور وفاداری کے اپنے زندگی کے ساتھی پر نثار ہو کر بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔

دوہے کے پہلے دو ٹکڑے

नेह सगा सोई सगा   छाड़ सगा न होय।

تو ناقابلِ اعتراض ہیں اور نفسیاتی مشاہدات کے بالکل مطابق ہیں۔
مثال میں البتہ گرفت کا موقع ہے مگر شاعر نے (غالباً سماجی طریق کی لاج
رکھنے کی خاطر) عورت کو idealize کیا ہے۔ وہ اس کا ذکر ہی
نہیں کرتا اور نہ شاعری میں اس کی ضرورت ہے کہ عورتیں زیادہ تر معاشرتی
دباؤ، خاندانی زور، وہم پرستی اور رسوم کی اندھا دھند تقلید میں اور جاہل
کند ذہن خود غرض برہمنوں کی غدارانہ پالیسی کی وجہ سے زبردستی جلائی جاتی
تھیں۔ وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ اکثر عورتیں بیوگی کی معاشی تکالیف اور معاشرتی
ذلت کے خوف سے ایک مرتبہ ہی آگ کی تکلیف جھیل کر موت میں سکھ پانے
کو بہ نسبت اس بیوگی کی زندگی کے قابلِ ترجیح سمجھتی تھیں جس میں انسان
دوسروں کا محتاج اور دوسروں پر بار بنکر زندہ موت کے مزے چکھنے اور
مردہ زیست گزارنے پر مجبور ہو۔ اس طرح وہ اپنے کفیل یا خاندان اور سرپرست کے
ساتھ ستی ہو کر تمام مصائبِ دنیوی سے نجات حاصل کرتی تھیں۔

شاعر عورت کو idealize کرتا ہے اور نہایت عمدگی سے

والدین پر ایک طعن آمیز چوٹ کرتا ہے۔ ایک سمجھدار، نکتہ شناش، ماہر باندان
کے لئے اس مختصر بات मा बैठी میں دنیائے معنی پنہاں ہے۔
ساس بہو کے تلخ تعلقات، ساس کا ظلم و تشدد اور بہو کی بے بسی و معصومیت
کے باوجود کسی شخص کی کریا کرم کو اس کی ماں بیٹھے دیکھتی رہے اور بیوی
شوہر پر بھینٹ چڑھائے جائے۔ دنیوی ناانصافی کا بدیہی ثبوت اور
عورت کی بے بسی کی صاف مثال ہے۔ شاعران تمام باتوں کو نہیں ظاہر کرتا
وہ صرف یہی کہتا ہے کہ "ماں بیٹھی رہے اور بیوی جلے" ہر ایک اس عجیب بات کو
دیکھے عجیب بات کیا ہے، یہی کہ خون دیکھتا رہے دل جلے۔ ظالم جسے مظلوم شہید ہو
ستانے والی آگ کے پاس نہ پھٹکے اور جس پر ستم ڈھائے گئے ہوں وہ
جیتی جاگتی مردہ شوہر کے ساتھ جل کر خاک ہو جائے کیا عجب ہے کہ ساس
اپنی حقیقی مگر ناقابل اظہار آرزو کو پورا ہوتے ہوئے یعنی بہو کو زندہ جلتے
ہوئے دیکھ کر تماشہ دیکھنے والی کی حیثیت سے لطف اندوز ہوتی ہو
بہر کیف ہندو مستورات نے بھی حتی المقدور مذہبی احکام کی پابندی
کی، ملت کے طریق کو خوب نباہا۔ اور وفاداری و محبت کی ایسی انتہائی
مثال دنیا کے سامنے پیش کر دی کہ جس کی نظیر کسی ملک کے کسی دور تاریخ

میں نہیں ملتی اور نہ آج کسی قوم میں پائی جاتی ہے۔

ہمچو ہندو زن کسی در عاشقی مردانہ نیست
سوختن بر شمع کشتہ کار ہر پروانہ نیست

(۵۱)

उत्तम जन सों मिलत ही औगुन सों गुन होय।
घनसंग खारो उदधि मिलि बरसै मीठो तोय॥

उत्तम (اتم) = اعلیٰ، عمدہ — अवगुन (اوگن) برائی۔
घनसंग (گھن سنگ) بادلوں کے ساتھ۔
उदधि (اودودھ) سمندر کا پانی۔ तोय (تویے) پانی

اُتم جن سوں ملت ہی، اوگن سوگن ہوئے
گھن سنگ کھارو اُودَدھ مل برسے میٹھو توئے

"عمدہ آدمیوں میں ملتے رہنے سے، برائیاں خوبیاں بن جاتی ہیں سمندر کا کھارا پانی بادلوں میں ملجانے کے بعد برستا ہے تو میٹھا

ہوتا ہے۔"

اثر پذیری کے اعتبار سے لوگ تین قسم کے ہو سکتے ہیں ایک تو
وہ جو فطرتاً بُرے ہوتے ہیں انھیں چاہے کتنی ہی عمدہ سوسائٹی میں رکھا
جائے یا اعلیٰ اخلاقی تعلیم دیجائے وہ کبھی درست نہیں ہو سکتے، دوسرے
وہ لوگ جو فطرتاً نیک ہیں انھیں دنیا کی بدترین سوسائٹی اور بدترین ماحول
نہیں بگاڑ سکتے، تیسرے قسم کے وہ لوگ ہیں جو فطرتاً نہ نیک ہیں نہ بد،
جن میں اچھے یا برے بننے کی صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں اور جس قدر انہیں
اثر پذیری کا مادّہ ہوتا ہے اسی قدر وہ اپنے ماحول سے متاثر ہوتے ہیں

۵۲

सात स्वर्ग अपवर्ग सुख धरिय तुला इक अंग
तुलै न ताहि सकल मिल जो सुख लव सत संग

स्वर्ग (سورگ) بہشت، अपवर्ग (اپورگ) غیر معمولی
तुला (تولا) ترازو، लव (لو) - فائدہ،

سات سورگ اپورگ سکھ، دھرئے تُلا اک انگ
تولے نہ تاہی سکل ملے جو سکھ لو ست سنگ

"اگر، ساتوں بہشت کی غیر معمولی خوشی کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھکر تولیے تب بھی میزان اس چین و افادہ کے برابر نہ ہوگا جو ہمیں عمدہ معاشرت (سوسائٹی) سے حاصل ہوتا ہے۔"

عمرانیات کا یہ بنیادی اصول ہے کہ معاشرت ہی نہ کہ سلطنت و افراد ترقی و تنزل کا حقیقی ماخذ ہیں۔ جب سوسائٹی میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے تو افراد اور امور سلطنت بھی برباد ہونے لگتے ہیں اور جیسے جیسے معاشرت کی حالت سدھرتی جاتی ہے ویسے ہی سلطنت کا کاروبار بھی سنبھلتا جاتا ہے اور افراد بھی بہتر ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں اس کلیہ کی تائید میں دلائل پیش کرنے کا موقع نہیں ہم اگر اسے تسلیم کرلیں تو تلسی داس کے اس دوہے کی قدر اور زیادہ بڑھ جاتی ہے ہم کسی طرح اس تبادلہ کو کہ انسان عمدہ معاشرت کے مبادلہ میں ساتوں بہشت دیدے غیر مفید نہیں ٹھیرا سکتے خصوصاً قومی نقطۂ نظر سے عمدہ معاشرت میں عمدہ قوانین اور کثیر مال و زر سے

بدرجہا بہتر ہیں۔ اگر ہندوستان میں اس قدر معاشرتی عیوب نہ ہوتے تو آج ہندوستان نہ اس قدر مفلس ہوتا اور نہ وہ یوں سیاسی و عمرانی مشکلات میں مبتلا رہتا۔

(۵۳)

अपनी प्रभुता को सबै बोलत झूँठ बनाय ।
वेश्या बरस घटावही योगी बरस बढ़ाय ॥

प्रभुता (پربھوتا) بڑائی فضیلت، वेश्या (ویشیا) عصمت فروش

اپنی پربھوتا کو سبئے بولت جھونٹ بنائے
ویشیا برس گھٹاوہی یوگی برس بڑھائے

" اپنی بڑائی (فضیلت) کے لئے ہر ایک بات بنا کر جھوٹ بولتا ہے۔ کسبن (اگر) عمر گھٹاتی ہے (تو) جوگی عمر بڑھاتا ہے"۔
جھوٹ خواہ مخواہ کوئی نہیں بولتا۔ اس کی محرک یا تو خود غرضی

خودغرضی کی طاقت زبردست ہے اس سے قوی تر وانتی[۱] کی طاقت ہے نپولین جیسے مردم شناس کا قول ہے کہ "وہ لوگ جو اور امور میں کتنے ہی عاقل کیوں نہ ہوں وانتی کے جذبہ سے وہ بھی مجبور ہیں۔ خوشامد قصیدہ گوئی انھیں بھی پسند ہے سلطنت کے خطابات، قوم کی تعریف کے وہ بھی آرزومند ہیں۔ اور تو اور گھر کے نوکر چاکر بھی کچھ دل خوش کن بات کہدیں تو ان کے لئے بہت ہے۔"

اسی جبلت سے مجبور ہوکر عورت اپنی عمر کم بتاتی ہے کیونکہ کمی عمر جوانی کا ثبوت ہے اور جوانی، دائمی جوانی، چونکہ ناممکن ہے لہذا عورت زمانہ جوانی کو حتی المقدور طولانی بناتا یا ظاہر کرنا چاہتی ہے جس عورت میں دنیوی آرزوئیں جس قدر زیادہ ہوں گیں اسی قدر وہ جوان رہنے

---

[۱] (Vanity) وہ جذبہ جو تمام جانداروں میں موجود ہے؛ اسی جذبہ سے مجبور ہوکر انسان اپنے آپ کو ظاہر کرنا اور "مشہور کرنا" چاہتا ہے "نام کی خواہش" "تعریف کی آرزو" چرچے کی ہوس سب اسی جذبہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اردو میں اس کے لئے کوئی لفظ نہیں۔ غرور، تبختر، گھمنڈ، ناز وغیرہ اس معنے میں کبھی کبھی بولے جاتے ہیں، مگر ان میں سے کوئی لفظ بھی Vanity کا مترادف نہیں۔

بننے یا ظاہرہ جوان دکھائی دینے کی آرزومند ہوگی۔ اسی لئے عورت عمر کم تبلاکر اپنی جوانی ظاہر کرنا چاہتی ہے۔

برخلاف اس کے سادھو کی عمر جس قدر زیادہ ہوگی یا ظاہرہ معلوم ہوگی اسی قدر عوام پر اس کا زیادہ اثر ہوگا۔ زہد و تقوی پرہیز و نفس کشی کی مدت جس قدر طولانی ہوگی اسی قدر رعب دینداری خاص و عام پر آسانی سے قائم کیا جا سکیگا۔ علاوہ برین بڑھاپا "خزانہ تجربہ" کے مانند شمار کیا جاتا ہے۔ لہذا سادھو کے لئے شان قائم کرنے اور دبدبہ کو برقرار رکھنے کے لئے زیادتی عمر بہت معین ہے پس سادھو جب کبھی جھوٹ بولتے ہیں یا توزیادہ تر اسی جذبۂ ذاتی سے مجبور ہو کر بولتے ہیں۔ "توجہ" "عزت" "وقار" اور "سطوت" کے آرزومند سادھو بھی ہوا کرتے ہیں۔ کون ہے جو شہرت کا طلبگار تعریف کا متمنی اور تحسین کا شیدائی نہ ہو؟ یا کم از کم اپنی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کا مشتاق نہ ہو؟

یہ دوھا اس کا ثبوت ہے کہ ہندی شعرا میں نفسیاتی مشاہدات کی کس قدر قوت ہے اور باوجود سادھو پرست ہونے کے ہندی شعرا سچائی کے اظہار میں کس درجہ اخلاقی جرأت و بے باکی

سے کام لیتے ہیں۔

عاشقانہ تخیلات

۵۴

अपनी गरज न बोलियत कहा निहोरे तोय ।
तू प्यारा मुय जीव का मो जियु प्यारा मोय ॥

نہورے = احسان

اپنی گرجن بولیت کہا نہورے توئے
تو پیارا موجیو کا، موجیو پیارا موئے

"میں اپنی خاطر تجھ سے بات چیت کرتی ہوں! تجھ پر کیا احسان ہے؟
تو میری زندگی کا پیارا ہے! اور میری زندگی مجھے پیاری ہے!"
ہندی شاعری کے بہترین نمونوں میں بلاشبہ اس دوہے کا بھی انتخاب
ہوگا۔ جس میں بلند خیالی، الفاظ کی شیرینی، ندرتِ تخیل سب کچھ موجود ہے۔
انتہائی محبت کی انتہائی دلیل قطعی بے غرضانہ سلوک ہے۔ حد یہ کہ محبوب کے دل میں
احساس احسان ہی پیدا نہ ہو اور اسے ہر طرح سکون و راحت نصیب ہو۔
جس وقت حبیب احسانات کا تذکرہ کرتا ہے تو یہ خیال کرکے احساس احسانات

اس کے دل پر بار ہے محبوبہ اس ادنیٰ تکلیف دینے کو بھی گوارا نہیں کرتی اور اس سے کہتی ہے کہ وہ خود غرضی کی وجہ سے ملتی جلتی اور اس سے بات چیت کرتی ہے کیونکہ محبوب اس کی جان کا پیارا ہے اور اس کی جان خود اُسے عزیز ہے! پھر محبوب پر کیا احسان ؟!

خصوصاً جب کہ تمام محبتی معاملات میں انسان ہمیشہ سے خود کو بے غرض، مخلص اور قربانی کا مجسّمہ ظاہر کرنے کا عادی ہے ایک محبوبہ کا خود غرض ظاہر کرنا (وہ بھی بالراست محبوب سے) ندرتِ تخیل کی انتہائی مثال ہے۔

(۵۵)

नदी किनारे धुआं उटत है. मैं जानूं कछु होय ।
जा कारन जोगन भई. वही न जलता होय ॥

ندی کنارے دھواں اُٹھت ہے میں جانوں کچھ ہوئے
جا کارن جوگن بھئی ، وہی نہ جلتا ہوئے

لڑائی اور کشیدگی کے معنی اختتام محبت کے نہیں۔ لڑائی ہو جائے، تعلقات منقطع ہو جائیں ملنا جُلنا چھوٹ جائے، پیام وسلام باقی نہ رہے پھر بھی جن لوگوں میں محبت ہو جاتی ہے اس کے اثرات مدت تک بلکہ بسا اوقات تا دم زیست قائم رہتے ہیں۔ قوی جذبہ کو قوی تر جذبہ مغلوب کر لیتا ہے اسیطرح کمزور محبت سے زیادہ قوی محبت کا اثر ہوتا ہے تاہم کمزور محبت بھی تو باقی رہتی ہے اور بغیر رنگ دکھلائے نہیں رہتی۔ اسی خیال کو ایک اردو شاعر نے بھی اچھی طرح ادا کیا ہے۔ ؎

غیر سے پوچھ لیا کرتے ہیں حالت میری

دل میں باقی ہے ابھی بوئے محبت میری

اسی حالت کو کسی ہندی شاعر نے ایک نہایت نازک پیرایہ میں یوں بیان کیا ہے۔

"ندی کے کنارے دھواں اٹھ رہا ہے میں سمجھتی ہوں کہ ضرور کچھ نہ کچھ ہو رہا ہے۔ (محبوبہ نے بوجہ اپنی وہم پرستی کے یہ خیال کر لیا کہ اس نے حبیب کو کہیں ضرر نہ پہنچا ہو اور وہ دل ہی دل میں کہتی ہے کہ ا

جس کی وجہ سے میں تارک الدنیا بنی کہیں وہی نہ جلتا ہوئے، مستورات کی زود اعتقادی، الم پرستی و وہمیت کے علاوہ دلی تعلقات اور اثرات محبت کی یہ پرکیف تصویر ہندی شعرا کے ماہر نفسیات ہونے کا ایک لاجواب ثبوت ہے۔

(۵۶)

प्रीतम हम तुम एक हैं   देखन के हैं दोय ।
मन से मन को तोलिये   कभी न दो मन होय ॥

پریتم ہم تم ایک ہیں، دیکھن کے ہیں دوئے
من سے من کو تولئے کبھی نہ دو من ہوئے

"اے محبوب ہم تم در اصل ایک ہیں۔ صرف دیکھنے کو دو ہیں جس طرح ترازو کے پلڑوں میں ایک من (اناج) کو ایک من (باٹ) سے تولئے۔ (تو ایک ہی من رہتا ہے کبھی دو من نہیں ہوتے (اسی طرح ہم تم ایک ہی ہیں)"۔

انتہائے محبت سے خواہش جاذبیت پیدا ہوتی ہے۔ ایک چاہتا ہے کہ دوسرے میں جذب ہو جائے اور دو کی تفریق ہی نہ رہے جسمانی اعتبار سے چونکہ یہ خواہش ناممکن ہے لہٰذا انسان، کمزور انسان اپنے دل کو خوش کرنے اور دماغ کو بھول بھلیوں میں ڈالنے کے لئے سوچ سونچ کر لیسے پیرایہ بیان اختیار کرتا ہے کہ جس سے ظاہرہ اس کے شوق کی کامیابی کا ثبوت ملتا ہو بعض مواقع پر فریب دماغ بھی کسی قدر دل خوش کن ہوتا ہے!

اسی قسم کا اور اسی جذبہ محبت کا پیدا کردہ فارسی شعر بہت مشہور ہے:-

من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری

مگر جو بات اس ہندی دوہے میں ہے۔ وہ فارسی شعر میں موجود نہیں من کے معنی ہندی میں دل کے بھی ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے جو لطف ہندی دوہے میں ہے وہ اس شعر میں کہاں؟

(۵۷)

कर कांपत पतियां लिखत. जल भर आवत नैन।
कोरो कागज हाथ दै. मुख ही कहयो बैन ॥

कर (کر) = ہاتھ　　　　جل (جل) = پانی

کَر کانپت پتیاں لکھت جل بھر آوت نین
کورو کاگج، ہاتھ دے مکھ ہی کہیو بین

"خط لکھتے وقت آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور ہاتھ تھر تھرانے لگے"
سادہ کاغذ ہی (پیامبر کے) ہاتھ دیکر کہا کہ زبانی ہی ہماری حالت زار
بیان کر دینا"۔

ہندی شعراء نفسیاتی لمحات
کو خوب سمجھتے تھے۔ ایک سنگدل، بے وفا اور خود غرض دنیوی انسان کی محبتو
جس کے دل میں محبت شوق ملاقات، یا یہ کہ سچا عشق موجود ہے اپنے محبوب کو
بلانے کے لئے اپنی حالت زار بذریعہ تحریر پیامبر کے ہاتھ روانہ کرنا چاہیئے

اور جب وہ لکھنے بیٹھتی ہے اس کا دل اپنے ناقابلِ بیاں مصائب کو ضبطِ تحریر میں لاتے وقت اُمنڈ آتا ہے آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں اور ہاتھ میں تھرتھراہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس یاس کی حالت میں بسا اوقات وہ کاغذ ہی پیامبر کو سپرد کر کے کہتی ہے "لکھ ہی کہنا ہیں" یعنے زبانی ہی میری حالت بیان کر دینا"

ایک شریف عورت اپنے تئیں اس قدر ذلیل کرے کہ اوّل تو ہائے پھر تحریراً مصائب بیان کرے یہ ہو نہیں سکتا۔ ایک ذلیل سے ذلیل انسان میں کچھ نہ کچھ خودداری ہوتی ہے اور ہر شریف عورت صرف ایک محدود درجہ تک اپنی ذلت گوارا کر سکتی ہے۔ بن بلائے اگر اس کا دل نہیں مانتا تو تحریراً مصائب بیان کرنا، جذبہ رحم کو مشتعل کرنا اس کے محبت کا دعویٰ نہیں بلکہ اس کے رحم کا فقیر بننا یہ بھی ہو نہیں سکتا۔

جذبۂ عشق اور قوتِ خودداری (Self-respect) کے باہمی تنازعہ کو جس طرح اس دوہے میں ادا کیا گیا ہے اس سے بہتر مثال تلاش سے بھی نہیں مل سکتی۔

(۵۸)

छुटी न ससुता की झलक झलकियो जोबन अंग।
दुयत देह दो हुन मिले देत ताफ़ता रंग॥

ससुता (سسوتا) بچپن۔
जोबन (جوبن) جوانی۔ अंग (انگ) جسم
देह (دیہہ) جسم हुन (ہن) رنگ۔
ताफ़ता (تافتا) دھوپ چھاؤں۔

چھٹی نہ سستا کی جھلک، جھلکیو جوبن انگ
دُونیت دیہہ دوؤ ہن ملے، دیت تافتا رنگ

ہندی شعرا کی بلند خیالی اور ندرت تشبیہ کی ایک مزید مثال یہ دوہا ہے۔ ایک کم عمر دوشیزہ کی جسمانی حالت کو ظاہر کرنے کے لئے کہتا ہے کہ ابھی بچپن (سستا) کا زمانہ مکمل طور پر ختم نہیں ہوا کہ جوانی جھلکنے لگی ہے یہ دورنگی جسمانی کیفیت ایسی ہے جیسے دو رنگوں (اودے اور لال) کے

ملنے سے دھوپ چھاؤں پیدا ہوتی ہے" ابتدائے شباب کو دھوپ چھاؤں سے تعبیر کرنا نہایت نازک اور لطیف مثال ہے۔

(۵۹)

عورت میں بہ نسبت مرد کے رشک کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے وہ چاہتی ہے کہ اس کا پتی ان تمام دوسری عورتوں سے نفرت کرے جو کسی طرح بھی زمرۂ رقابت میں داخل ہوسکیں اس حسرت کو یعنی اپنے پتی کو صرف اپنے ہی لئے مخصوص کرنے کے لئے وہ خود ہر قربانی و جانفشانی کے لئے بخوشی آمادہ ہوتی ہے۔

आजा प्यारे नैन में पलक ढांप तोय लूं।
ना मैं देखूं और को ना तो को देखन दूं॥

آجا پیارے نین میں، پلک ڈھانپ توئے لوں
نا میں دیکھوں اور کو، نا تو کون دیکھن دوں

"اے پیارے میری آنکھوں میں سما جا۔ اور میں تجھے پلکوں سے ڈھانپ لوں

نائیں کسی اور کو دیکھوں اور نہ تجھے دیکھنے دوں"

"ونا توکوں دیکھن دوں" دوہے کا یہ ٹکڑا بہت ہی مزیدار ہے

(۶۰)

اسی قسم کا ایک دوہا ہے جو نفسیاتی نقطۂ نظر سے بہت ہی دلچسپ ہے

ہر انسان کے دماغ میں کچھ حصہ ایسا ہوتا ہے جس کے باعث اس سے

ایسے حرکات سرزد ہوتے ہیں جو عقل کے سراسر خلاف ہوں۔ ٹھوکر کھانے

سے انسان کو فوراً طیش آجاتا ہے اور اسکی طبیعت بے تحاشہ اس پتھر یا

رکاوٹ کو ٹھکرانا چاہتی ہے جس سے اسے ٹھوکر لگی ہو۔ جس چیز (مثلاً

تخت کے کونے یا میز کے پائے) سے کسی بچہ کو ضرر پہنچتا ہے اور وہ بچہ رونے

لگتا ہے۔ اس بےجان چیز کو "مارنے" سے بچوں کی طبیعت جس طرح بہل جاتی

ہے اور بچوں کے "جذبۂ انتقام پسندی" کو تسلی ہوتی ہے اسی طرح معمر اشخاص

بھی اپنے دل کی بھڑاس بدعقلی سے نکالتے ہیں، کوسنے کی عادت بد دعا دینے

کی خصلت، اسی جذبۂ سے پیدا ہوئی جب کسی ماہر فن کا کام نہیں سنبھلتا۔

اور اس کی طبیعت چھڑ چھڑی ہو جاتی ہے تو وہ اسی جذبۂ سے مجبور ہو کر اپنے

اوزار توڑ دیتا ہے۔ کھانا پسند نہ آئے تو کھانے کے برتن پھینک دیتا ہے

غرضکہ یہ روزانہ مشاہدے کی بات ہے کہ انسان کے کردار میں عدم عقلیت
بھی بہت ہے۔ دماغ[1] کا یہ "غیر عاقلانہ عنصر" رشک و جلاپے کے معاملات
میں کس درجہ قوی ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ ہم بہ آسانی اس دوہے سے
کر سکتے ہیں جو اپنی قسم کا ایک ہی ہے۔

---

(۱) مزید تشریح کے لئے دیکھئے:۔ کارل برنکمان (Carl Brinkmann)
کی تصنیف Gesellschaftslehre (مطبوعہ Springer
برلن سنہ ۱۹۲۵ء) بالخصوص باب پنجم موسومہ "Die Irrationalität
als soziologischer Grundbegriff" اور اطالوی ماہر عمرانیات
Vilfredo Pareto کی مشہور و قابل دید تصنیف "Trattato di
Sociologie generale" جس کا خلاصہ جرمن میں Grundriss der Soziologie
nach Vilfredo Pareto کے نام سے شائع ہوا ہے
(ناشر G. Braun بمقام کارلز روہے سنہ ۱۹۲۶ء) اس کتاب
کے چوتھے اور پانچویں باب میں عدم عقلیت اور غیر عاقلانہ افعال کی اہمیت و اثرات
پر نہایت عمدگی سے بحث کی گئی ہے۔

चोंच तिहरी काटके तापै छिड़कौं नौन।
पिय मेरे में पीवकी तू पी कहै सो कौन॥

नौन (نون) نمک पिया पीव (پیا، پیو) محبت کرنے والا یا شوہر

چونچ تمہاری کاٹ کے تا پے چھڑکوں نون!
پیا میرے میں پیو کی، تو پی کہے سو کون؟

پپیہا "پی پی" پکار رہا ہے اور جب اس کی آواز سے وہ متوجہ ہوتی ہے۔ تو اسے اول تو سخت جلایا ہوتا ہے کہ کوئی اور "پی پیو۔ پی" کیوں کہے۔ اس کے "پی" کو کوئی اور "پی" کیوں پکارے! ایک تو وہ خود اپنے شوہر کی مفارقت کی وجہ سے جلی بھنی بیٹھی ہے اس پر وہ ایک آواز کو سنتی ہے کہ اس کے پیو کو بلا رہی ہے پھر کیا تھا؟ اس کے جلاپے کی کوئی انتہا نہ رہی اور اس نے اپنی دلی خواہش کا اظہار کیا کہ "تیری چونچ کاٹ کر اس پر نمک چھڑکنے کو طبیعت چاہتی ہے۔"

ایک ہی دوہے میں انتہائے محبت کا ثبوت (پیا میرے میں پیو کی)

جلاپے کا اظہار (تو پی کہے سے کون) اور ساتھ ہی غیر
عاقلانہ عنصر دماغ کی قوت (چونچ تمہاری کاٹ کے تاپے چہر کوں نون)
جس عمدگی سے ظاہر ہو رہے ہیں وہ انتہائی داد و قدر دانی کے مستحق ہیں

(۶۱)

یادگار غالب میں مولانا حالی مرحوم و مغفور نے مرزا غالب اور حضرت
سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے شعروں کا ایک جگہ موازنہ کیا ہے شعر مفصلہ ذیل ہیں

غالب

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

سعدی

گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم
چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

اس موازنہ کا فیصلہ مولانا نے اس طرح کر دیا ہے کہ مطلب تو
دونوں شعروں کا ملتا جلتا ہے مگر سعدی کے بیان میں اس قدر شبہ
باقی رہجاتا ہے کہ ممکن ہے کہ معشوق اپنے عاشق کے ظاہری حالت سے

اس کے دل کی کیفیت کا اندازہ کر سکے کیونکہ وہ کہتے ہیں معشوق کے
آنے پر غم دل سے دور ہو جاتا ہے، مگر یہ نہیں کہتے کہ میری ظاہری حالت
بھی بدل جاتی ہے۔ اور مرزا کے یاں ظاہری حالت کا بدل جانا بھی مقصود
ہے۔ غم دل بیان کرنے کا تذکرہ بھی نہیں ہے۔ لہذا یہاں معشوق کی غلط
فہمی رفع ہونے کا امکان ہر طرح غیر ممکن ہے۔ تاہم مرزا کے شعر پر شیخ کے
شعر کو ضرور ترجیح دیجانی چاہئے کیونکہ شیخ نے یہ شعر مرزا کے شعر سے پہلے کہا ہے۔

اب بہاری کا ایک دوہا ملاحظہ فرمائیے اس نے بھی مرزا سے بہت
پہلے لکھا ہے اور شیخ علیہ الرحمہ سے اگر پہلے نہیں تو کم از کم فارسی نہ جاننے
کی وجہ سے اس کے کان اس شعر سے نا آشنا ضرور تھے۔

जो वाके तन की दसा देख्यो चाहत आप।
तो बलि नेक बिलोकिये चली आवो चुप चाप॥

दसा (دسا) حالت बिलोकये (بلو کیئے) = جلدی کیجئے

جو واکے تن کی دسا دیکھیو چاہت آپ
تو بلی نیک بلوکیئے چلی آؤ چپ چاپ

ایک ہمدم وہمراز جو عاشق اور معشوق دونوں کی ہمدرد ہے وہ معشوق سے کہہ رہی ہے۔ "اگر آپ اپنے عاشق کی حالت زار دیکھنا چاہتی ہیں میں صدقے جاؤں ذرا اچانک اور چپ چاپ چل کر دیکھئے"!

مفہوم یہ ہے کہ اُسے کسیطرح یہ پتہ نہ چلے کہ آپ دیکھنے آرہی ہیں ورنہ اس خوشی کی خبر سے اس کی حالت بدل جائے گی اور آپ اس کی صحیح حالت کا اندازہ نہ کر سکیں گی۔

اب غور فرمائیے کہ مرزا غالب کے شعر میں معشوق کے آنے سے منہ پہ رونق آجاتی ہے اور سعدیؒ کے شعر میں معشوق کے آنے سے غم دل کافور ہوجاتا ہے مگر بہاری کے دوہے میں محض معشوق کے آنے کی خوشخبری سے عاشق کی حالت بدل جانے کا یقین ہے میرے نزدیک تو شاعر نے نازک خیالی کی حد کردی۔ اس کے علاوہ بہاری نے جن ہندی محاورات کو نظم کیا ہے جس بندش کی صفائی اور شوکت الفاظ سے کام لیا ہے اس کا ذکر کرنا ہی فضول ہے" (۱)

---

(۱) اس دوہے کی تشریح و توضیح جناب پنڈت جنیشور پرشاد صاحب مائل دہلوی نے کی ہے ماخوذ از رسالہ "اردو" جلد دوم حصہ پنجم بابت جنوری ۱۹۲۲ء صفحہ ۱۴۷-۱۴۹

(۶۲)[1]

"ایک نازنین جس کا شوہر پردیس میں ہے بناؤ سنگار کرکے کوٹھے پر چاند دیکھنے چڑھی تو اس کی ہم سن لڑکیوں نے چھیڑنا شروع کیا کہ یہ بن ٹھن کس کے لئے ہے وہ جواب دیتی ہے:-

आज चन्द्रमा दौज है जग चितवत चहुँ ओर।
हमरे और वा मित्र के नैन भोए इक ठार ॥

चन्द्रमा दौज (چندرما دوج) - نیا چاند ओर (اور) = طرف -

آج چندرماں دوج ہے جگ چتوت چہوں اور
ہمرے اور وا متر کے نین بہئے اک ٹھور

"آج ہلال نکلنے والا ہے اور ایک زمانہ اس کو دیکھتا ہے (کیا عجب ہے کہ) میری اور اس (پیارے) کی نگاہیں اسی طرح آپس میں مل جائیں" درد مہاجرت میں

---

(۱) ماخوذ از "جذبات بھاشا" مصنفہ نیاز محمد خاں صاحب نیاز فتحپوری مطبوعہ نگار پریس اشاعت دوم صفحہ ۱۳۱ -

یہ وفورِ شوق کس درجہ جدت کا پہلو لئے ہوئے ہے"

(۶۴)

छोटी मोटी कामिनी सबही बिष की बेल।
बैरी मारे दांव दै यह मारे हंसि खेल॥

कामिनी (کامنی)۔ نازک اندام بिष (بس)۔ زہر
बैरी (بَیری)۔ دشمن۔

چھوٹی موٹی کامنی سب ہی بِس کی بیل
بَیری مارے داؤں دے یہہ مارے ہنسی کھیل

"(عورتیں) چھوٹی موٹی یا نازک ہوں، سب ہی زہریلی بیل کے مانند ہیں دشمن (پہلوان) داؤ دیکر مارتا ہے تو یہہ (عورتیں) ہنستی کھیلتی گھائل کرتی ہیں"

ابتدائے عشق و محبت میں منازلِ محبت و نسبت جس تیز رفتار سے طے ہوتے ہیں اور جس آسانی سے انسان محبوب کے دامِ محبت میں پھنستا ہے

اِس کیلئے یہ کہنا:۔

"بیری مارے داؤ دے یہہ مارے ہنسی کھیل"

بہت لطیف انداز بیان ہے تعجب ہے کہ یہ ساکھی کبیر داس کی لکھی ہوئی ہے کبیر زیادہ تر تصوف، آلہیات، پند و نصائح۔ دنیوی حقائق فلسفیانہ موضوعات پر لکھتے تھے اور شاذ و نادر ہی انہوں نے دنیوی عشق و محبت پر خیال آرائی کی۔ اس ساکھی کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کبیر نے ضرور عمداً اس قسم کی شاعری سے حذر کیا ہوگا۔ اور اگر وہ چاہتے اور اس میں مشق کرتے تو اس قسم کے بھی باکمال شاعر بن سکتے تھے۔



عشقیہ دوہے

(६४)

इन अंखियां दुखयान को सुखसरजो ही नाहिं।
देखत बनै न देखते बिन देखे अकुलाहिं॥

ان اکھیاں دوکھیان کو سکھ سر جو ہی ناہیں
دیکھت بنے نہ دیکھتے بن دیکھے اکولائیں

"ان آنکھوں کی قسمت ہی میں چین نصیب نہیں ہے (عشق و محبت میں ڈوبی ہوئی دلفروز و دلگداز) آنکھیں دیکھی بھی نہیں جاتیں اور بغیر دیکھے ہوئے چین نہیں آتا۔"

(६५)

تاثیر حسن

अमी हलाहल मध भरे. स्वेत श्याम रत नार
जियत मरत झुक झुक परत. जिह चित वत इक बार॥

अमी (امی) آبحیات۔ हलाहल (ہلاہل) زہر۔

मध (مدھ) شیرنی۔ स्वेत (سویت) سپید۔

रतनार (رتنار) : لال चितवत (چتوت) دیکھتی ہے۔

امی ہلاہل مدھ بھرے، سویت شیام رتنار
جیت مرت جھک جھک پرت جیہہ چتوت اکبار

"اس کی آنکھوں میں) آبحیات زہر اور شراب (تینوں موجود ہیں) (لہذا) (وہ) سفید، سیاہ، اور سرخ ہیں۔ (یہ آنکھیں) جدھر نظر کرتی ہیں وہ جیتا، مرتا، اور جھک جھک پڑتا ہے"۔

جس کسی نے حسن کامل دیکھا ہو اور اسے وہ کیفیت یاد ہو جو اس قسم کی آنکھوں کے دیکھنے سے ہوتی ہے وہ مصرعہ ثانی میں مبالغہ آمیزی نہیں پائے گا۔

۶۶

नैन सलौने अधर मधु। कहु रहीम घट कौन।
मीठा चाहिये लौन पै। मीठे हू पै लौन॥

(لون) نمکین अधर (ادھر)۔ ہونٹ

نین سلونے، ادھر مدھو، کہو رحیم گھٹ کون؟
میٹھو چھیے لون پے، میٹھے ہو پہ لون!

"آنکھیں نمکین اور ہونٹ شیریں ہیں، اے رحیم (ان دونوں میں)
کون ادنیٰ درجے کا ہے؟" اس کا جواب انصاف محبت یہہ دیتا ہے:۔
"نمکین کے بعد شیریں اور شیریں پر نمکین چیز چاہیئے" (یعنی اپنی اپنی
جگہ دونوں خوب ہیں)

(٦٧)

محبت میں ثبات چاہیے

छिनहिं चढ़ै छिन उत्तरै. सो तो प्रेम न होय ।
आठ पहर लागियो रहै. प्रेम कहावै सोय ॥

چھن چڑھے چھن اترے، سو تو پریم نہ ہوئے
آٹھ پہر لاگیو رہے، پریم کہاوے سوئے

"محبت کی خاصیت یہ نہیں کہ ذرا میں بڑھے اور ذرا میں کم ہو جائے محبت تو وہی ہے جو آٹھوں پہر (ہر وقت) رہے"!!

(۶۸)

مستقل مزاجی

टुकडे टुकडे देह हों तन से निकलै प्रान।
तब हूं मुख त्या गो कहौ पिया नाम की तान ॥

देह (دیہ) جسم ' प्रान (پران) جان۔

ٹکڑے ٹکڑے دیہہ ہوں تن سے نکلے پران
تب ہوں مکھ تیا گو نہیں پیا نام کی تان

"اگر جسم ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے اور جان بھی نکل جائے تب بھی یہ زبان محبوب کا نام لینے سے کسی طرح باز نہیں رہ سکتی۔"

(۶۹)

परदेसी की प्रीत को सब को मन ललचाय।
अवगुन वामें एक है रहै न संग लै जाय ॥

پردیسی کی پریت کو، سب کو من للچائے
اوگن وا میں ایک ہے، رہے نہ سنگ لیجائے

پردیسی کی محبت کے لئے سب کا دل للچاتا ہے برائی اس میں ایک
ہے کہ وہ نہ رہتا ہے نہ ساتھ لے جاتا ہے ۔

(٧٠)

लगत भली बिछुरत बुरी जरौ बरौ यह रीत ।
किन सुख पायो री सखी परदेसी की प्रीत ॥

रीत (ریت) = طریقہ ۔

لگت بھلی بچھرت بُری، جرو برو یہ ریت
کن سکھ پایو ری سکھی، پردیسی کی پریت

محبت بھلی ہے مفارقت بری۔ اس طریق (محبت) کا برا ہوئے
سہیلی پردیسی سے محبت کرنے سے کیسے چین نصیب ہوتا ہے۔"

(۱۷)

सांई सकारै जायगे सो नैन मरेंगे रोय।
बिधना ऐसी रैन कर कि भोर कभू ना होय॥

बिधना (بدھنا) خدایا۔ भोर (بھنور، سویرا)

سائیں سکارے جائیں گے سو نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کر کہ بھنور کبھو نہ ہوئے

میرے حبیب کل صبح سویرے جائیں گے اور آنکھیں رو رو کر
مریں گی اے خدا ایسی رات کر کہ جس کی صبح ہی نہ ہو۔"

(۷۲)

گلہ و دعویٰ

बांह छुड़ाये जात हो सु निबल जान कें मोय,
हृदय में से जाओगे तो मर्द बदूंगो तोय ॥

बाँह (بانھ) - ہاتھ   निबल (نِبَل) کمزور۔

بانھ چھڑائے جات ہو سو نِبَل جان کے موئے
ہردے میں سے جاؤ گے، تو مرد بدوں گی توئے

"مجھے کمزور سمجھ کر میرا ہاتھ چھڑائے جا رہے ہو! دل میں سے جاؤ گے تو میں تمہیں مرد سمجھوں گی۔"

(۷۳)

حسرت دید

कागा नैन निकास दूं सो पिया पास लै जाय,
पहले दर्ष दिखाये कें पाछे लीजो खाय ॥

दर्ष (دَرش) = دیدار   कागा (کاگا) - کوّا

کاگا نین نکاس دوں، سو پیا پاس لیجائے
پہلے درش دکھائے کے، پاچھے لیجیو کھائے

"اے کوّے آنکھیں نکالے دیتی ہوں تو انھیں پیا کے پاس لیتا جا
پہلے انھیں دیکھ لینے دے پھر کھا لینا"

(۷۴)

कागा सब तन खाइयो चुन-चुन खय्यो मांस।
दो नैना मत खाइयो कि पिया मिलन की आस॥

کاگا سب تن کھائیو، چن چن کھائیو ماس
دو نیناں مت کھائیو، کہ پیا ملن کی آس

"اے کوّے سارا جسم کھالے۔ اور چن چن کر سارا گوشت کھا جا
صرف دو آنکھوں کو نہ کھانا جن سے پیا کے ملنے کی امید
ہے"

(۸۵)

हौं साजन जानत नही पिया बिछुड़न की सार
जिया बिछुड़न से है कठिन पिया बिछुड़न की बार

ہوں ساجن جانت نہیں پیا بچھڑن کی سار
جیا بچھڑن سے ہے کٹھن پیا بچھڑن کی بار

" اے ساجن تو جانتا نہیں کہ پیا کے بچھڑنے سے کیا تکلیف ہوتی ہے
جان کے جدا ہونے سے زیادہ تکلیف دہ حبیب کی جدائی کا صدمہ
ہوتا ہے "

(۸۶)

अरे पपीहा बावरे आधी रैन जिन कूक,
धीरे धीरे सुलगती सो तूने दीनी फूक॥

बावरे (باورے) = پاگل۔ जिन (جن) = مت

ارے پپیہا باورے آدھی رین جن کوک
دھیرے دھیرے سلگتی سو تونے دینی پھوک

"اے پاگل پپیہے آدھی رات کو مت پکار (فرقت کی آگ) آہستہ
آہستہ سلگ رہی تھی تونے (پی پی) پکار کر مجھے میرے پیو (حبیب) کی یاد دلادی اور
اس آگ کو تیز کر دیا"

(۷۷)

شوق ملاقات

कांट भयो तन सूरव के परहे कोई श्वास ।
अरे दई ले चल वहीं जहां पिया का बास ॥

کانٹ بھیو تن سوکھ کے پرہے کوئی سانس
ارے دئی لے چل ابھی جہاں پیا کا باس

"تن سوکھ کر کانٹا ہوگیا مگر اس میں اب بھی کچھ سانس باقی ہے

اے ہوا مجھے اسی وقت وہاں (اڑا کر) لے چل جہاں میرا محبوب ہو"

(۷۸)

प्रीतम तुम जिन जानीयो तुम बिछुरें मुइ चैन।
आले बन की लाकरी सुलगत हूं दिन रैन॥

پریتم تم جن جانیؤ تم بچھریں موی چین
آلے بن کی لاکری سلگت ہوں دن رین

" اے محبوب یہ نہ سمجھ کہ تجھ سے بچھڑنے کے بعد مجھے چین مل سکتا ہے
ش ہرے جنگل کی لکڑی کے مثل ہوں جو ہجر کی آگ میں دن رات سلگتی رہتی
ہوں"۔

(۷۹)

जलज भयो केहर भयो श्वान भयो फिर आय।
अब उबाह चाहत भयो बिरहा बुरी बलाय॥

جلج بھیو کیھر بھیو، سوا ن بھیو پھر آئے
اب اُبا ہ چاہت بھیو، برہا ری بلائے

عالم ہجر میں ہمارا یہ حال ہو گیا ہے کہ ہم گھُلتے گھُلتے (خون کی کمی کی وجہ سے) زرو پڑ گئے (जलज भयो) مفارقت کی مزید ایذا نے گھلا کر (گوشت کی کمی کی وجہ سے) دبلا بھی کر دیا (केहर भयो) پھر بھی یار کی یاد نے پیچھا نہ چھوڑا اور اب تو یہ نوبت ہو گئی ہے کہ تکالیف نے مغز استخوان کو بھی گھلا ڈالا اور اب صرف چمڑے اور ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے अब उबाह चाहत भयो یعنے قریب المرگ ہیں........
اب ان ہڈیوں کو بھی یہ مفارقت تمام کر کے رہیگی[1]

(۸۰)

بہت کم لوگ ایسے گذرے ہیں جن میں دور اندیشی پیش بینی اور زمانہ

---

(۱) اس دوہے کی مزید تشریح کرنا اس کی لطافت کو بگاڑنا تھا۔ لفظی ترجمہ بھی اسی وجہ سے نہیں کیا گیا کہ لفظی ترجمہ میں اس کی خوبی تمام غارت ہو جاتی ہے اور وہ بھدا معلوم ہوتا ہے۔

شناسی کا مادہ ہو ایسے لوگ شاذ و نادر پائے جاتے ہیں جو کہ موجودہ حالات سے زمانہ آیندہ کا کم و بیش صحیح تصور کر سکیں۔

जो मैं ऐसा जानती कि प्रीत किये दुःख होय।
नगर ढंडोरा पीटती कि प्रीत न करयो कोय॥

جو میں ایسا جانتی کہ پریت کئے دکھ ہوئے
نگر ڈھنڈورا پیٹتی کہ پریت نہ کریو کوئے

"اگر میں یہ جانتی کہ محبّت کرنے سے دکھ ہوتا ہے تو میں گاؤں میں ڈھنڈورا پیٹتی کہ محبت کوئی نہ کرے"

(۸۱)

شوق ملاقات و بیتابی دل کو ہندی شعراء نے کئی طرح ظاہر کیا ہے

اس قسم کے بہترین دوہوں میں بلا شبہ حسب ذیل دوہا ہے۔ جو اپنی دل گداز کیفیت کی باعث ممتاز نظر آتا ہے۔

सांझ भई उर दिया जरे पिया न आये पास।
नैनन सें दुइ गंग बहीं उर डूबन लागी आस॥

سانجھ بھئی اور دیا جرے پیا نہ آئے پاس
نینن سے دوئی گنگ بہیں اور ڈوبن لاگی آس

सांझ (سانجھ) ۔ شام   दिया (دیا) ، چراغ ۔
नैनन (نینن) ، آنکھ ۔

"شام کا وقت ہوا اور چراغ بھی جل گئے مگر پیا اب تک نہ آئے
آنکھوں سے آنسو رواں ہوے اور نا امیدی ہونے لگی۔"

(۸۲)

یہ بڑا پیارا دوہا ہے جس میں قابل تعریف بات یہ ہے کہ محبوبہ خود
اپنی آنکھوں سے کہتی ہے۔

नैना रे तुमही बुरे तुमसा बुरा न कोय।
आपही पीत लगाय के आपही बैठे रोय॥

نیناں رے تم ہی برے، تم سا برا نہ کوئے
آپ ہی پیت لگائے کے آپ ہی بیٹھے روئے

"اے آنکھو! تم ہی بری ہو اور تمہارے برابر کوئی برا نہیں۔ خود ہی محبت کی آگ لگاتی ہو اور خود ہی بیٹھی رویا کرتی ہو!"

۸۳

पीतम तुम परदेस सिधारे· लै गये मेरा चैन।
तुमरे कारन राम दुहाइ · तड़पत हूं दिन रैन

پیتم تم پردیس سدھارے لے گئے موراچین
تمرے کارن رام دہائی تڑپت ہوں دن رین

"اے پیارے تم پردیس گئے اور میرا چین بھی لے گئے۔ تمہارے لئے میں دن رات تڑپ رہی ہوں۔"

(۸۴)

प्रीत किये धन धर्म गयो उर बिगड़े सिगरे काम।
अपने थे सो गैर भये उर नाम हुआ बदनाम॥

پریت کئے دھن دھرم گیو اور بگڑے سگرے کام
اپنے تھے سو غیر ہوئے اور نام ہوا بدنام

"میں نے محبت کی دولت و ایمان دیا اور سارے کام بگڑے جو
دوست تھے وہ دشمن ہوگئے اور نام بھی بدنام ہوا۔"

(۸۵)

वारिस दाता आन बचाओ नय्या पड़ी मंझधार।
सांई आपन दया करो के लागे बेड़ा पार॥

وارث داتا آن بچاؤ نیا پڑی منجدھار
سائیں آپن دیا کرو کے لاگے بیڑا پار

"اے وارث داتا آکر بچاؤ ناؤ منجدھار میں پڑی ہے اے مددگار آپ رحم کیجئے تاکہ بیڑا پار ہو۔"

متذکرہ بالا تین دوہوں کو اردو میں نظم بھی کیا ہے ناظرین کی تفریح طبع کے لیے میں اس نظم کو نقل کرتا ہوں۔

دیا ایماں لگا یا داغ اپنی پارسائی میں
خدا کو چھوڑ بیٹھے ان بتوں کی آشنائی میں

یتیم تم پردیس سدھارے لیگئے موڑ چین
ترے کارن رام دوہائی تڑپت ہوں دن رین

تڑپتا ہوں مرے پیارے سکھن تیری جدائی میں

بیت گیو دھن ہم گیو اور بگڑے سگرے کام
اپنے تھے سو بیر ہوئے اور نام ہوا بدنام

تمہارے واسطے رسوا ہوئے ساری خدائی میں

وارث داتا آن بچاؤ نیا پڑی منجدھار
سائیں آپ دیا کرو کے لاگے بیڑا پار

تمہارا نام تو مشہور ہے مشکل کشائی میں

ساجن تورے درشن کو ترست ہوں دن رین
تارے گنتی رہت ہوں پلک لگے نا نین

"اے ساجن ترے دیدار کے لئے دن رات ترس رہی ہوں۔ تارے گنتی رہی ہوں۔ نہ پلک جھپکتی ہے نہ نیند آتی ہے۔"

(۸۷)

बिरहा जलती देखके सांई आए धाय ।
प्रेम बूंद सें सींच कें तन सें लियो लगाय॥

برہا جلتی دیکھ کے سائیں آئے دھائے
پریم بوند سے سینچ کے تن سے لیو لگائے

"ہجر میں جلتی دیکھ کے حبیب دوڑے آئے اور آب محبت سے (آگ بجھا کر) گلے لگا لیا۔"

نفسیاتی مشاہدات

و

متفرقات

(۸۸)

کبیرداس کے دو دوہے ہیں جو ایک ہی تصویر کے دو رخ پیش کرتے ہیں۔

चलती चक्की देखके दिया कबीरा रोय।
दो पाटन के बीच में साबित बचा न कोय॥

چلتی چکّی دیکھ کے دیا کبیرا روئے
دو پاٹن کے بیچ میں ثابت بچا نہ کوئے

دونوں پاٹوں سے مراد ظاہر ہے کہ آسمان اور زمین ہے۔
جس میں روندے جانے سے کوئی نہ بچا۔ سب بری طرح پیسے گئے۔

(۸۹)

اس شکوے کا جواب خود کبیرداس ہی نے دیا ہے۔

मानी (مانی): چکی کے نیچے کے پاٹ کی کیلی جس کے سہارے چکی کے اوپر کا پاٹ گھومتا ہے۔

چاکی چاکی سب کہیں مانی کہے نہ کوئے
مانی سے جو لگ رہا بال نہ بیکا ہوئے

"پسے جانے کی سب شکایت کرتے ہیں اور وسیلہ نجات کی کوئی پرواہ نہیں کرتا اگر وہ اس کا لحاظ کرے تو اس کا بال بیکا نہ ہو" یعنی یہ کہ ہوس زیست میں جو لوگ مبتلا ہیں وہ تو بیشک پسے جا رہے ہیں۔ مگر جو لوگ دنیوی تعیشات و خواہشات سے بے نیاز ہو گئے ہیں اور مانی سے لگ رہے ہیں ان کو ذرا بھی دھکا نہیں پہنچا۔ انہیں سب کچھ حاصل ہے

(۹۰)

जा घट प्रेम न संचरै सो घट जान मसान।
जैसे खाल लुहार की सांस लेत बिन प्रान॥

घट (گھٹ) دل، ظرف، सञ्चरै (سنچرے): داخل ہوئے

मसान (مسان) = مرگھٹ۔

جا گھٹ پریم نہ سنچرے سو گھٹ جان مسان
جیسے کھال لوہار کی سانس لیت بن پران

"جس دل میں محبت نہ داخل ہو اس دل کو مرگھٹ سمجھو (وہ دل مردہ ہے جس میں محبت نہ ہو) وہ اس لوہار کی کھال کے مانند ہے جو بیجان ہو کر بھی سانس لیتی ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ مثال عمدہ دی گئی ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ دلی خواہشات کے مطابق جو کام ہوتا ہے اس میں مستقل مزاجی کی زیادہ توقع ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ دلی خواہشات سے اور کام کاج سے کیا تعلق؟ دیکھنا یہ چاہئے کہ جو کام انجام پا چکا ہے وہ کیسا ہے۔ وہ مردہ چمڑہ جس سے مفید کام ہو سکے اِن زندہ انسانوں سے بدرجہا بہتر ہے جن سے کوئی کام انجام نہیں پا سکتا!

افادہ کے نقطۂ نظر سے خلوص کا موجود رہنا ضروری ہے یا نہیں؟ یہ ایک نیم عمرانی اور نیم معاشیاتی مسئلہ ہے جس کی مختصر توضیح اس کے

بعد کے دوسرے دوہے میں کی گئی ہے۔

(۹۱)

रामराम सब कोइ कहे ठग ठाकुर और चोर।
बिना प्रेम रीझें नहीं तुलसी नन्द किशोर

رام رام سب کوئی کہے ٹھگ ٹھاکر اور چور
بنا پریم ریجھے نہیں تلسی نند کشور

ठाकुर (ٹھاکر) ظالم، جابر، रीझे (ریجھے) خوش ہوئے۔

"ہر ایک شخص رام رام کہتا ہے، ٹھگ (بھی)، ظالم (بھی)، اور چور (بھی)۔ اے تلسی مگر بغیر محبت (خلوص کے) خدا کو خوشی نہیں ہوتی۔"

(۹۲)

شاعر، سچا شاعر جذبات یا واقعات سے متاثر ہو کر اپنے خیالات جو کسی موقع پر اس کے دل میں پیدا ہوتے ہوں موزوں کرتا ہے شاعر میں برخلاف کسی فلسفی کے، تضاد خیالات کا پایا جانا کوئی عیب نہیں

وہ بعض اوقات دنیا کو بہشت سمجھتا ہے اور بعض اوقات اس کو دوزخ سے بدتر ٹھیراتا ہے یہہ اور اسی قسم کی ہزاروں باتیں اس کا عیب نہیں بلکہ خوبی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تلسی داس ہی خیالات بالا کے برخلاف فرماتے ہیں

तुलसी अपने राम को　　रीझ भजौ के खीज।
उलटे सीधे जाम हैं　　खेत परे के बीज॥

रीझ (ریجھ) = ایمانداری، خلوص سے،

भजो (بھجو) = بھجن کرو، نام لو، عبادت کرو۔

खीज (کھیج) = اوپرے دل سے ظاہرداری یا ریاسے۔

تلسی اپنے رام کو ، ریجھ بھجو کہ کھیج
اُلٹے سیدھے جام ہیں کھیت پڑے کے بیج

"اے تلسی اپنے خدا کی ایمانداری سے عبادت کرو یا اُپرے دل سے نتیجہ یکساں ہی ہوگا کھیت میں بیج الٹے سیدھے سبھی اُگتے ہیں۔"

خدمت قوم اور خدمت جماعت کے موقع پر اکثر دو قوتیں کام کرتی ہیں۔ لہٰذا جب کبھی آدمی قربانی پر آمادہ ہوگا اس کی محرک قوتیں صرف دو ہونگیں۔ ایک نام ونمود کی ہوس یعنی تشہیر ذات کا چرچا اور دوسرے جذبہ خدمت اور فرض شناسی۔

یعنی انسان یا تو خودغرضی سے کام کرتا ہے یا خلوص سے، اسی طرح مالی قربانی کے وقت مثلاً اپاہج خانہ، علمی ادارہ، دارالغربا یا دارالمعذورین کے لئے چندہ دیتے وقت بھی نام ونمود کی خواہش (اخباروں میں تذکرہ ہوگا عام جلسوں میں شکریہ پیش کیا جائیگا۔ کم از کم رپورٹ میں نام شائع ہوگا) اور دوسروں کی امداد کرنے کی خواہش یعنی نفس پرستی اور جذبۂ ہمدردی پیش نظر رہتا ہے چاہے محرک کچھ ہی کیوں نہ ہو خلوص ہو یا دکھاؤ، ہمدردی یا نام ونمود کا شوق چندہ پانے والی جماعت کو نمود پسندی اور خلوص سے کوئی بحث نہیں اور نہ یہ اس کے لئے قابل لحاظ ہیں۔ جب دو شخص مساوی رقم کسی علمی ادارہ یا مستحق انجمن کو عطیہ کے طور پر دیتے ہیں تو دونوں سے یکساں فیض پہنچتا ہے اسی طرح جنگ عظیم یا کسی اور قومی معرکہ کے وقت جن لوگوں نے ایمانداری سے اپنی قوم کی خدمت کی قطع نظر اس کے کہ ان لوگوں نے نام کی خاطر

یا قومی خدمت کی خاطر فوج میں شرکت کی تھی ملک و ملت کی یکساں
خدمت انجام دی تھی اسی طرح مقید ممالک کے باشندے جو قومی آزادی
کے لئے کوشاں ہیں قطع نظر اس کے کہ وہ نام کیخاطر یا فرض شناسی کے
اثر سے مجبور ہو کر خلوص سے لڑ رہے ہیں بشرطیکہ ان کی جدو جہد یکساں ہے
آزادی اقوام کے لئے مساوی القدر خدمات انجام دے رہے ہیں انہی باتوں کو
تلسی داس نے مذہبی رنگ میں بیان کیا ہے حاصل کلام یہ کہ انسان کو خدمت کرنی
چاہیے اور قومی بہتری کیلئے کوشاں رہنا چاہئے غرض چاہے ہو یا نہ ہو اگر ہو تو کچھ ہی ہو

۹۳

दर दिवार दरपन भये   जित देखूं तित तोय ।
कांकर पाथर ठीकरी   भये आरसी मोय ॥

दरपन (درپن) آئینہ   भये (بھئے) ہوئے

در دیوار درپن بھئے، جت دیکھوں تت توئے
کانکر، پاتھر، ٹھیکری بھئے آرسی موئے

تصوف اور ہمہ اوست کا فلسفہ اہل ہنود میں بھی عام ہے۔ اگرچہ ہندی شاعری پر اسلام کا گہرا اثر پڑا ہے[1] مگر یہ خیال صحیح نہیں کہ ہمہ اوست کے فلسفہ کو ہندوؤں نے مسلمانوں سے سیکھا۔

"(گھر کے) در و دیوار (بھی) ہمارے لئے آئینہ ہوتے جہاں دیکھتا ہوں تو ہی تو ہے، کنکر، پتھر اور ٹھینکری (بھی) ہمارے لئے (معرفت کا) آئینہ بن گئے۔"

ع ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار!

(۹۴)

ढोल गंवार सूद्र पषु नारी ।
सफल तार पा के अधिकारी ॥

पषु (پشو) مویشی۔ सफल (سپھل) سخت

तार पा (تارنا) سزا ۔ अधिकारी (ادہیکاری) مستحق

(۱) ملاحظہ ہو ڈاکٹر یوسف حسین خان۔ بی اے، (جامعہ) ڈی۔ لٹ (پیرس) کا مضمون "ازمنہ وسطی کے بعض ہندو شاعروں پر اسلامی اثر" (رسالہ "جامعہ" دہلی۔ بابتہ فروری سنہ ۱۹۳۰)

ڈھول، گنوار، شودر، پشو، ناری
سکل تاڑنا کے ادھی کاری

"ڈھول، گنوار، شودر، (نیچ ذات کے لوگ) جانور اور عورتیں سخت زدوکوب کی مستحق ہیں" عوام الناس ہی نہیں بلکہ خاص الخاص لوگوں میں بھی جنکا شمار ہوتا ہے وہ ہمیشہ سے عورت کی بے عزتی و بے حرمتی کرتے رہے عورت کو ادنیٰ کنیز سمجھنا، اس کے ساتھ حاکمانہ برتاؤ کرنا ہماری معاشرت میں مطلق عیب نہیں سمجھا جاتا معاشرت کے جذبات کسی ایسے شخص کے خلاف مشتعل نہیں ہو جاتے۔ جو عورتوں کے ساتھ بُرا سلوک کرتا ہو اسی لئے شاعر بھی زمانہ کے رنگ یا کسی فوری جذبہ سے متاثر ہو کر عورت کو مثل جانور کے سختی کا مستحق سمجھتا ہے۔ اس مشرقی شاعر ہی نے اپنے ہم قوم افراد کو یہ نصیحت نہیں دی بلکہ جرمانیہ کا مشہور آفاق فلسفی فریدرش نٹشے نے اپنے شہپارہ میں عورت ہی کی زبان سے کہلوایا کہ۔

"تم کیا عورتوں کے پاس جاتے ہو؟ اپنی قمچی نہ بھول جانا،،(۱)

---

(۱) دیکھئے Thus spake Zarathustra انگریزی ترجمہ T. Common مطبوعہ Allen & Unwin بمقام لنڈن ۱۹۲۳ء ص ۸۰

عورتوں کو روندنے کا مشورہ اکثر بدظن، بدگمان اور مستورات سے نفرت کرنے والے رہنماؤں نے دیا ہے۔ کسی ایرانی حکیم کا قول ہے کہ "زن زر و زمین = زندگی کے لئے زہر ہیں" غصہ سے مغلوب ہو کر صنف نازک کے خلاف کچھ کہنا اور بات ہے اور حقیقی طور پر عمل کرنا جداگانہ شئے ہے۔ مشرقی ممالک نے خصوصیت سے عورتوں کے ساتھ قابل نفرت برتاؤ کیا۔ چینی مرد عورتوں کے پیر مروڑ کر چلنے پھرنے سے انھیں معذور کر دیتے تھے۔ عرب کسی پہاڑی پر اپنی معصوم لڑکی کو چھوڑ آتے تھے۔ ہندوستانی مرد عورتوں کو اپنے مردہ شوہر کے ساتھ زندہ جلاتے تھے گو یہ رسم و رواج اب باقی نہیں رہے پھر بھی ہمارے حاکمانہ برتاؤ میں کوئی فرق نہیں ہوا۔ اور تو اور اب تک تحکم کا لہجہ بھی ہم نے نہیں بدلا۔

(۹۵)

मोहे न नार नार के रुपा ।
पन्नगार यह नीत अनूपा ॥

नार (نار، عورت) रुपा (روپا) قائل

पनगार (پنگار) = فطری، قدرتی، अनूपा (انوپا) عجیب۔

موہے نہ نار، نار کے روپا
پنگار یہ نیت انوپا

"عورت عورت کی قائل نہیں ہوتی یہ عجیب قدرتی طریق ہے"۔

یہ صحیح ہے کہ عورت میں بہ مقابلہ مرد کے، حسد، بغض عداوت دشمنی، رشک جلاپا زیادہ ہوتا ہے مگر ایسی عورتیں ہر ملک اور ہر زمانہ میں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ جن میں خلوص بے غرضی، ایثار قربانی اور سچی دوستی رہی ہو۔ ایک فرانسیسی حکیم کا قول ہے کہ "اس عورت کو اچھا سمجھو جس کی تعریف کوئی عورت کرے!"

یہ سب صحیح ہے مگر ان کے مدمقابل اقوال بھی تو اتنے ہی صحیح ہیں یعنی یہ کہ مرد کو مرد بھی پسند نہیں کرتا۔ طلوع مہتاب سے تارے کبھی خوش نہیں ہوتے، مرد کو مرد سے بغض حسد ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے یہ بروا پسند نہیں یہ خواہ مخواہ عورتوں کی فطرت میں عیب جوئی ہے حقیقت نگاری نہیں اور نہ انصاف پسندی ہے جس فلسفیانہ تخیل میں جامعیت

وانیت کی جھلک بھی نہ پائی جائے وہ کس کام کا؟ عورت ہی پر کیا منحصر ہے مرد مرد کے کب قائل ہوتے ہیں؟ جس قدر عورتوں میں حلیا پا ہوتا ہے کم از کم اسی قدر مردوں میں بھی ہوتا ہے۔

(۹۶)

सदा भुमगोपाल की जामैं अटक कहा ।
जाके मन में अटक है सोई अटक रहा ॥

भुम (ہجوم): زمین

سدا بھوم گوپال کی جا میں اٹک کہا
جاکے مَن میں اٹک ہے سوہی اٹک رہا

رنجیت سنگھ ایک بار اپنی فوج کے ہمراہ غنیم کے مقابلہ کو جا رہے تھے راہ میں دریائے اٹک ملا۔ رنجیت سنگھ کو لوگوں نے کسی قدر پریشان حالی میں اطلاع دی یعنے یہ کہ اب کیا ہو؟ اس وقت رنجیت سنگھ نے یہ دوہا فی البدیہہ کہا۔

"تمام زمین خدا کی ہے اس میں رکاوٹ کی کونسی بات ہے؟
جس کے دل میں رکاوٹ ہوگی وہی رک جائے گا"

دوہے میں کوئی خاص بات نہیں چونکہ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے
دریا کا نام اٹک ہے اور بادشاہ رنجیت سنگھ کا فی البدیہ دوہا ہے۔ لہذا
تاریخی اعتبار سے قابل لحاظ ہے۔

(۹۷)

धजा फरकती समर मां बाजे अनहद नूर ।
तकया है मैदान मां पहुंचैगा कोई सूर ॥

धजा (دھجّا)۔ نشان کا پھریرہ समर (سمر) میدان جنگ۔
सूर (سور) = پہلوان۔

دھجا پھرکتی سمر ماں، باجے انہد نور
تکیا ہے میدان ماں، پہنچیگا کوئی سور

"نشان جنگ میدان میں لہلہا رہا ہے اور طلب جنگ کا نقارہ

بج رہا ہے ظاہر ہے کہ مقابلہ کے لئے کوئی بہادر ہی پہنچیگا !"

(۹۸)

کسی دوہے کی تشریح میں بیان کرچکا ہوں کہ خودغرضی بیشتر برائیوں کی جڑ اور کئی عیوب کا اصلی ماخذ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں لوگ زیادہ تر انہیں کا ساتھ دیتے ہیں جن سے انہیں فائدہ کی امید ہو۔ ابنائے وقت، حاکمین سلطنت دولتمندوں اور برسراقتدار اشخاص کی مدد کرتے ہیں اور ان کی مدح سرائی میں مصروف رہتے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ وہ دل ہی دل میں کتنے ہی ان حاکمین سلطنت، دولتمندوں اور برسراقتدار اشخاص سے بیزار اور بدظن کیوں نہ ہوں، امید نفع ان کی خودغرضی کی جبلت کو ابھارتی ہے اور ضمیر کے اعتراضات اور دل و دماغ کی صدائے احتجاج کو خاموش کردیتی ہے نہ صرف یہ کہ انسان طاقتوروں کا ساتھ دیتا ہے بلکہ کمزوروں پر (چاہے وہ مالی اعتبار سے غریب ہوں یا جسمانی نقطۂ نظر سے کم طاقت ہوں) کچھ قوت آزمائی کی غرض سے کچھ نفس امارہ کو محظوظ کرنے کی خاطر تشدد برتتا ہے اور تو اور مدرسہ کے طلبہ میں جب بھی اتفاقاً ہی آپس میں چھیڑ چھاڑ ہوتی ہے اس وقت بھی "تو از ان قوی" کا یہ منظر

ہرایک کے مشاہدہ میں آتا ہے کہ متوسط طاقت کے لڑکے سب سے زیادہ طاقت کے لڑکوں سے مل جل کر رہنے کے آرزومند ہوتے ہیں اور ان کے آگے "باادب" "متین" اور "سنجیدہ" بنے رہتے ہیں اور کمزور لڑکوں کو خواہ مخواہ (مذاق کے بہانہ ہی سے) دھول دھپا لگاتے رہتے ہیں۔

غیر مساوی توازن قوت کا یہہ منظر زندگی کے ہر شعبہ اور دنیا کے ہر کونہ میں پایا جاتا ہے۔ برسر حکومت نا اہل لوگوں کے سامنے زمانہ گردن جھکاتا ہے اور عقلمند فہیم، غیور معتوبین عہد کو معمولی سے معمولی اہلکار اور ادنیٰ ملازمین بھی نظر حقارت سے دیکھتے ہیں۔ دنیا کا یہہ طرز بدترین شکل معاشی عالم میں اختیار کرتا ہے۔ قوانین سلطنت، آئین معاشرت اور احکام عدالت غریبوں اور امیروں، بیکسوں اور مالداروں پر یکسانیت سے منطبق نہیں کئے جاتے۔ دولتمندوں اور ان کی اولاد کے لئے عفو تقصیر کی خاطر "اصول" کا لحاظ کیا جاتا ہے اور غریبوں پر "مثال قائم کرنے کے لئے" یا دوسروں کو عبرت دلانے کی غرض سے انتہائی سزا دیجاتی ہے۔ دنیا کا یہ دورخی طرز عمل اس قدر عام ہے کہ اس کا مشاہدہ کسی خاص ملک یا شہر تک مخصوص نہیں بلکہ ایک عام حقیقت ہے جو زماں و مکاں Time & space

کے قیود سے آزاد ہے۔

انہی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ورند نے ایک لاجواب دوہا کہا ہے جو اس قابل ہے کہ ہندی کے بہترین دوہوں میں شمار کیا جائے۔

सबै सहायक सबलके कोउ न निबल सहाय।
पवन जगावत आगको दिपहि देत बुझाय॥

सहायक (سہائک) = مددگار۔ सबल (سَبل) طاقتور۔
निबल (نِبل) کمزور، पवन (پَوَن) آگ

سَبَے سہائک سَبَل کے کوُ نہ نِبَل سہائے
پَوَن جگاوَت آگ کو، دیپہی دیت بجھائے

"سب ہی طاقتوروں کے مددگار ہوتے ہیں، کمزور کی کوئی بھی اعانت نہیں کرتا ہوا آگ کو بھڑکاتی اور چراغ کو بجھا دیتی ہے۔"

سَبَل (طاقتور) کے لفظ کو وسیع ترین مفہوم میں تصور کیجئے!

خیال کیجئے کہ جب کسی لکڑی کے کارخانہ، پھونس کے چھپر، چراگاہ prairies یا جنگل میں آگ لگ جاتی ہے تو کس طرح (وہی ہوا جو چراغ کو گل کر دیتی ہے) شعلوں کو بھڑکاتی ہے۔

اس تمثیل کے پردے میں حقیقت پنہاں ہے! اس شاعرانہ انداز تحریر میں دنیوی طرز عمل کا حقیقی عکس نظر آتا ہے!

(۹۹)

रहे समीप बड़ेन के होत बड़ो हित मेल।
सब ही जानत बढ़त है वृक्ष बराबर बेल॥

समीप (سمیپ) = قریب۔ हित (ہت) محبت
वृक्ष (برکش) درخت

رہے سمیپ بڑین کے ہوت بڑو ہت میل
سب ہی جانت بڑھت ہے برکش برابر بیل

"بڑے ادمیوں کے قریب رہنے سے اچھے میل ملاپ رہتا ہے

(ان کے بیل بوتے اور ان کی ہمدردی و اعانت سے انسان ترقی کرتا ہے، سب ہی جانتے ہیں کہ درخت کے برابر بیل بھی بڑھتی ہے۔"

شہنشاہ فرانس ہونے کے بعد نپولین نے اپنے بھائیوں کو مختلف ممالک کی بادشاہتیں دی تھیں۔ اپنے بڑے بھائی جوسف کو اس نے نیپلز اور بعد میں ہسپانیہ کا بادشاہ بنایا اپنے چھوٹے بھائیوں، لوئی اور جیروم کو علی الترتیب ہالینڈ اور شرقی فالیہ (جرمانیہ) کی بادشاہت دی اپنے سوتیلے بیٹے ایوژن کی بوریا Bavaria کی شہزادی سے شادی کرا کے اطالیہ کا وائسرائے بنادیا اور اپنی سوتیلی بیٹی ہارتنس کی شادی اپنے بھائی لوئی سے اور اپنی بہن پولین کی شادی اپنے عزیز سپہ سالار مورات سے کرا کے مورات کو نیپلز کا بادشاہ بنایا اور اپنے سگے بیٹے کو روم کی بادشاہت عطا کی اس طرح انھیں لوگوں نے (جو بغیر نپولین کے غیر معروف زندگیاں بسر کر دیتے) برسر اقتدار رہ کر بادشاہتیں کیں اور اپنا نام تاریخ یورپ میں ہمیشہ کے لئے زندہ کر گئے!

(۱۰۰)

कबीर संगत साधु की ज्यों गंधी का बास ।
जो कुछ गंधी दे नही तौ भी बास सु बास ॥

गंधी (گندہی) = عطر فروش سुबास (سباس) = خوشبو

کبیر سنگت سادھو کی، جیوں گندہی کا باس
جو کچھ گندہی دے نہیں تو بھی باس سُباس

"اے کبیر عقلمند کی صحبت مثل عطر فروش کی بو کے ہے عطر فروش اگر کچھ (عطر) نہ بھی دے تب بھی جو بو آتی ہے وہ خوشبو ہوتی ہے۔"

عقلمندوں اور با اخلاق انسانوں کی فیض صحبت کو ظاہر کرنے کے لئے اس سے زیادہ موثر طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟

ضمیمه

ضمیمہ

(۰)

حوالہ کتب ان لوگوں کے لئے جو ہندی ادب سے شوق رکھتے ہیں اور اس زبان کی نثر و نظم کا مطالعہ کرنا چاہتے ہوں :-

(۱) کوتا کومدی कविता कौमुदी (حصہ اول و دوم)

مصنفہ رام نریش ترپاٹھی، مطبوعہ ہندی مندر۔ الٰہ آباد۔

اس ہندی کتاب میں بیشتر عمدہ ہندی شعراء کے کلام کا انتخاب ہے اور ہر شاعر کے مختصر حالات زندگی و خصوصیات شاعری بھی بیان کئے گئے ہیں۔ ابتداء میں ہندی کی مختصر تاریخ، مقدمہ میں دی گئی ہے جو بجائے خود نہایت کارآمد ہے قابل مصنف نے اختصار مگر جامعیت سے ہندی ادب کا موازنہ اردو گجراتی وغیرہ سے کیا ہے۔ اور ہندی زبان کے تعلق کو وشنو (وشنو کی پوجا کرنیوالے) جین سکھ اور

مسلمانوں سے ظاہر کیا ہے۔ حصہ اول میں چند بردائی و کبیر داس سے لے کر گوبند گلا بھائی تک اور دوسرے حصہ میں عہد حاضرہ یعنے ہرسچندر سے لے کر سوبھدرا کوماری چوہان تک کے ممتاز شعرار کا بیان ہے ضمناً یہ تذکرہ بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ کوتا کومدی (कविता कौमुदी) کے تیسرے حصہ میں سنسکرت ادب کی چوتھے میں اردو نظم و نثر کی تاریخ ہے۔ ہر حصہ تقریباً (۴۰۰) صفحات کا ہے اور عمدہ کاغذ پر صفائی کیساتھ شائع ہوا ہے۔ جو لوگ ہندی سے معمولی طور پر بھی واقف ہوں اس کتاب سے بہت مستفید ہوسکتے ہیں۔

"A History of Hindi Literature" by F. E. Keay. M.A. (Church Missionary Society) Published in the "Heritage of India" Series (۳)

1920.

انگریزی زبان میں ہندی ادب کی تاریخ متوسط تقطیع کے (۱۰۸) صفحوں

میں بیان کی گئی ہے۔ ہندی سے سرسری واقفیت کے لئے یہ کتاب

بیشک موزوں ہے مگر مصنف ہندی بھاشا کا عالم نہیں معلوم ہوتا۔

اور باوجود اس کے کہ Editorial Preface

میں ہمیں یقین دلایا جاتا ہے کہ "To every book

(of the Heritage of India Series)

two tests are rigidly applied: every thing must be scholarly, and every thing sympathetic"

ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ کم از کم اس کتاب میں نہ تو عالمانہ تحقیق کا ہر جگہ لحاظ کیا گیا ہے اور نہ طرز تحریر ہمدردانہ ہے باوجود ان نمایاں کمزوریوں کے یہ کتاب مبتدیوں کے لئے بری نہیں کیونکہ تقریباً اوسط تقطیع کے ۱۰۰ صفحوں میں حتی المقدور اختصار سے اہم ترین شعراء و نثر نگاروں کا تذکرہ کیا گیا ہے ہندی کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں اور ہندی زبان کی ابتدا و بروز پر ایک باب میں ذکر ہوا ہے

(۳) **جذبات بھاشا** مصنفہ نیاز محمد خان نیاز فتحپوری

رئیس التحریر رسالۂ "نگار" لکھنو۔

اردو میں ہندی ادب پر موجودہ زمانے کی سب سے زیادہ مشہور کتاب جس میں تقریباً ۔ ہندی دوہوں کا اور پدماوت کے سراپا اور حسن سے متعلقہ ۳۰ چوپائیوں کا انتخاب ہے ہندی دوہے اور چوپئیاں صرف اردو رسم الخط میں لکھی گئی ہیں اور لفظی و معنوی تشریح بھی کیگئی ہے اکثر مقامات پر نیاز صاحب نے صحیح داد دی ہے مگر کہیں کہیں مبالغہ سے کام لیا ہے اور وجدانی حیلے بھی استعمال کئے ہیں۔ انتخاب میں جس قدر دوہرے چوپائیاں وغیرہ ہیں وہ بلا استثنے سب حسن و عشق سے متعلق ہیں اور بعض میں جنسی جذبات و واقعات کو اسطرح آزادی سے بیان کیا گیا ہے کہ مذاق سلیم جو کنایات کو زیادہ پسند کرتا ہے انہیں عریاں بیانی سے تعبیر کریگا۔ صرف عشقیہ و جنسی دوہوں کے انتخاب کی غالباً وجہ یہ ہے (جیسا کہ "تقریب" میں خلیقی دہلوی یقین دلاتے ہیں) کہ نیاز صاحب کی یہ تصنیف ان کے "بہت زیادہ اور عمدہ مواد" ہندی بھاشا کی پہلی قسط ہے۔ اور وہ "اگر پبلک نے ضرورت سمجھی تو اپنی معلومات کا

بقیہ حصہ بھی پیش کریں گے۔"

حالانکہ اس "قسط اول" کو تیار ہوئے (۱۵) سال سے زائد ہو چکے ہیں اور اس کی خاصی قدر بھی ہوئی پھر بھی "بقیہ" اقساط کے پیش کرنیکا وعدہ ہنوز پورا نہ ہوا۔ ہمیں نیاز فتحپوری سے امید ہے کہ وہ بقیہ اقساط ہندی کلام کو اس سے زیادہ حسن و خوبی سے پیش کر سکیں گے۔ کیا ہم انہیں اپنے ایفائے عہد کی جانب متوجہ کریں؟ بہر طور یہ کتاب بحیثیت مجموعی عمدہ اور قابل دید ہے۔ نیاز صاحب نے اس کے لئے ایک "دیباچہ" اور ان کے دوست خلیقی دہلوی نے ایک تقریب لکھی ہے۔ جن میں (گو کسیقدر بے ربطی ہی سے سہی) بعض اہم اور مفید باتیں لکھی ہیں۔ تمہید کتاب ہذا میں ان سے بھی مدد لی گئی ہے۔

(۴) **کبیر جنم ساکھی اردو** مصنفہ منشی محمد خلیل صاحب انصاری مطبوعہ شاہجہانی پریس دہلی سنہ ۱۹۲۵ء

جس میں گوسائیں تلسی داس کے مختصر حالات زندگی بھی درج ہیں۔ ان دونوں شاعروں کو مولف نے زبان ہندی کا آفتاب و ماہتاب ٹھہرایا ہے اسی سے مولف کے معلومات ہندی ادب کا پتہ چلتا ہے

کہ سورداس، کیشوداس، بیہاری لعل، بلکہ عبدالرحیم خانخاناں پر کبیرداس
کو ترجیح دی گئی ہے۔ یہ رسالہ (جس میں بعض عمدہ دوہوں اور کبتوں کا انتخاب
اور ان کی معمولی تشریح بھی ہے) غیر عالمانہ طرز، انتشار، عدم تسلسل، بے ربطی
اور غیر مصدقہ بیانات کا عجیب مجموعہ ہے۔ کبیر داس کے [illegible] نے
کے سلسلہ میں مسئلہ توحید پر مولف نے اپنے ذاتی خیالات کا بھی اظہار
کیا ہے "اور ضمناً" اپنی پانچ غزلیں لکھ دی ہیں تاکہ وہ لوگ جو نظم میں
مطالب کو زیادہ آسانی سے سمجھ سکتے ہوں خلیل صاحب کے نغمۂ توحید،
راز توحید اور غزلہائے توحید کو پڑھ کر محظوظ ہوں! اردو میں ہندی
ادب پر اس قدر کم لکھا گیا ہے کہ اس رسالہ کو دیکھ کر مجبوراً یہ کہنا پڑتا
ہے کہ ایں ہم غنیمت است!

۵۔ مسر بندھو بنود۔ تین حصوں میں جملہ تعداد صفحات (۱۳۱۴)

گنگا پستک مالا کاریالے۔ لکھنؤ ۱۹۲۷ء

مسر برادران نے متحدہ کوشش سے ہندی ادب کی یہ تاریخ تحقیقات
کے بعد وجامعیت سے مرتب کی ہے جس میں تقریباً دو ہزار ہندی
شعراء کے نام، مختصر حالات زندگی، تعداد و اسمائے تصانیف کے

علاوہ اس مقامات کا بھی ذکر ہے جہاں یہ بیشتر غیر مطبوعہ علم و ادب کے خزانے شایقین ہندی کے لئے محفوظ رکھے گئے ہیں۔ یہ تین بھائیوں کی تین جلدیں خوب چیز ہیں اور اس قابل ہیں کہ ہندی ادب کے شوقین ان سے استفادہ کریں۔ مگر میری رائے میں ہندی کی ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد کوتا کومدی کے حصہ اول سے ابتدا کرنی چاہیئے اور جس شخص میں اس قدر قابلیت آجائے کہ وہ ایک لغت کی مدد سے اس کو سمجھ سکے تو اس کی تمام تکالیف و محنتوں کا دوچند نعم البدل مل جائے گا جو اسے ہندی کے سیکھنے میں گوارا کرنا پڑتا ہوں کیونکہ اس کتاب میں تمام بہترین ہندی شعرا کا عمدہ انتخاب کیا گیا ہے۔

۱۳۴۰ ف

اشتہار کتب

عمرانیات و مسئلہ تعلیم | جرمانی و امریکی ماہرین تعلیمات و علماء عمرانیات کی تصانیف سے مدد لے کر اور ذاتی غور و فکر کے بعد ڈاکٹر جعفر حسن صاحب نے "مسئلہ تعلیم و علم مرفۃ الحالی" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس میں پہلی مرتبہ اردو زبان میں علم مرفۃ الحالی و تعلیمات کے چند اہم نظریے بیان کئے گئے ہیں پھر ان کو ہندوستانی تعلیمی حالات پر منطبق کر کے "عمرانیات و مسئلہ تعلیم ہند" کے عنوان سے ہندوستان کے مسئلہ تعلیم کو ایک نئی روشنی میں ایک علحدہ مضمون لکھ کر پیش کیا ہے۔ یہ دونوں مضامین رسالہ کی شکل میں "عمرانیات و مسئلہ تعلیم" کے نام سے عنقریب شایع ہو رہے ہیں

ناشر۔ جامعہ ملیہ۔ قرول باغ۔ دہلی حجم تقریباً ۸۰ صفحات

افلاس ہند | زرعی افلاس ہند کی وسعت ظاہر کرنے کے بعد، افلاس ہند کے وجوہ بیان کئے گئے ہیں اور ایک جداگانہ باب میں افلاس ہند کو دور کرنے کے طریقوں پر مدلل بحث کی گئی ہے۔ ہندوستانی معاشی حالات سے جن لوگوں کو دلچسپی ہو ان کے لئے اس رسالہ کا مطالعہ خصوصیت سے مفید ہوگا

مصنف۔ ڈاکٹر جعفر حسن صاحب ناشر۔ صدر جمعیۃ اتحاد امداد باہمی محدودہ۔ حیدر آباد دکن صفحات ۵۰ قیمت ۸ر